معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے　　فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک　　بیس پونڈ　　یا　　بتیس ڈالر

　　بحری ڈاک　　سات پونڈ　　یا　　گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۹　ماہ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۷ء　عدد ۵

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

تلخیص و تبصرہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

۲۷/اپریل کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ جناب محمد فاروق نعمانی کی وفات کی وجہ سے ملتوی ہوگیا اور ۲۸/اپریل کو ۱۰ بجے دن میں شروع ہوا، جس میں مندرجہ ذیل ارکان شریک ہوئے

مولانا محمد سعید مجددی (بھوپال)، پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی (علی گڑھ) مولانا محمد رابع ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) مرزا امتیاز احمد بیگ (اعظم گڑھ) ڈاکٹر سلمان سلطان (اعظم گڑھ) جناب عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری اور راقم السطور۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عین روانگی کے وقت ضعف و اضمحلال بڑھ جانے کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے، مجلس انتظامیہ کے سربراہ پرنس مفخم جاہ بہادر ملک سے باہر تھے جس کی اطلاع بہت پہلے آگئی تھی۔ خواجہ محمد یوسف (کلکتہ) اور مولانا تقی الدین ندوی (ابوظبی) کے بھی معذرت نامے آئے۔

موقر ارکان نے دارالمصنفین کے پچھلے سال کے کاموں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے آیندہ کے منصوبوں پر غور و خوض فرمایا، طباعت کے نظام پر اطمینان ظاہر کرنے کے باوجود اسکا معیار مزید بہتر بنانے کی ہدایت کی، دراصل اس زمانے میں صاف ستھری طباعت کے لیے آفسٹ مشین ضروری ہوگئی ہے جو صاحب خیر کی اعانت ہی سے میسر آسکتی ہے، علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے دائرے کو وسعت دینے پر بھی زور دیا گیا، جس کے سلسلے میں بار بار عرض کیا جاچکا ہے کہ دارالمصنفین کی موجودہ آمدنی میں لائق اور مناسب افراد کی خدمات حاصل کرنا دشوار ہے۔ تصنیف و تالیف کی تربیت کرنے والے ایسے طلبہ بھی نہیں ملتے جو ایثار و قناعت کے خوگر اور علمی شوق و جذبہ سے سرشار ہوکر کسی خاص موضوع پر باقاعدہ تیاری کریں، یہ بھی ملحوظ رہے کہ اب عربی مدارس اور جدید تعلیم گاہوں کا معیار تعلیم پست ہوگیا ہے، اس لیے ان کے فضلا برسوں کی محنت و ریاضت کے بعد ہی دارالمصنفین کے کام کے ہوسکتے ہیں، لیکن ایسے صبر آزما اور پتہ مار کام کے لیے تن آسان اور سہولت پسند طلبہ کہاں آمادہ ہوسکتے ہیں۔

دارالمصنفین کی مالی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی تمام تصنیفات کے جن میں درجنوں کی طباعت مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے بعد سے نہیں ہوسکی، صحیح اور محقق ایڈیشن شایع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، اس سلسلے میں اولیت سیرۃ النبی کی جلدوں اور علامہ شبلیؒ کی تصنیفات کو دی گئی ہے یا پھر ان آوٹ آف اسٹاک کتب کو جن کی اشاعت کی کوئی صاحب خیر ذمہ داری لے لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ علامہ شبلی کی سیرت کے دونوں حصوں کی اشاعت کا سامان انکے دو عزیزوں اور معتقدین نے اپنی جیب خاص سے کردیا۔ اب بقیہ حصوں کی اشاعت کیلئے مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عقیدتمندوں کی طرف ہماری نگاہ اٹھ رہی ہے توقع ہے کہ وہ ان کی اشاعت میں ہمارا تعاون کریں گے۔ ۲۷/اپریل کو پروفیسر ریاض الرحمن شروانی نے "علامہ شبلی کی شخصیت کے امتیازی پہلو" پر توسیعی خطبہ دیا، اس میں شہر کے اصحاب علم و دانش بڑی تعداد میں شریک ہوئے، یہ پر مغز مقالہ معارف کے آیندہ شمارے میں شایع ہوگا۔

افسوس ہے کہ ۲۶ و ۲۷/اپریل کی درمیانی شب میں جناب محمد فاروق نعمانی نے الٰہ آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا، وہ مولانا شبلی کے برادر زادہ اور مولوی محمد اسحٰق صاحب وکیل ہائی کورٹ کے صاحبزادے تھے، جو اعظم گڑھ میں مولانا کے علمی و تعلیمی اور خاندانی جائداد اور زمینداری کے کاموں میں انکے خاص دست و بازو تھے، ان کے انتقال پر مولانا نے ایسا پر درد مرثیہ لکھا جو اردو کی عزائیہ شاعری میں بے مثال ہے، فاروق صاحب اس وقت کم سن تھے، اس کی طرف مولانا نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

فاروق صاحب شبلی کالج کے پرجوش اور سرگرم ممبر تھے، دارالمصنفین سے بھی ان کو گہرا اور جذباتی تعلق تھا، یہاں کی دعوتوں اور جلسوں میں شریک رہتے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، لاگ لپیٹ انکو نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

اس سال ایام حج میں منیٰ میں آتش زدگی کے المناک واقعہ میں ہزاروں حجاج جاں بحق ہوئے اور اس سے بھی سوا زخمی ہوئے، ستر ہزار خیمے جل گئے، جو لوگ زندہ بچے ان کو کیسی ذہنی و دماغی اذیت برداشت کرنی پڑی ہوگی، یہ لوگ لاکھوں روپے خرچ کرکے، اعزہ واقربا کو چھوڑ کر اور زحمت سفر برداشت کرکے حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے لیکن اس بھیانک واقعہ کی وجہ سے ارکان و مناسک ادا نہ کرسکے اور حج کی سعادت سے محروم رہے، آگ کسی کی غلطی سے لگی ہو لیکن اس کے اس قدر پھیل جانے اور ہیبت ناک شکل اختیار کرلینے میں کیا ذمہ داروں کی غفلت و کوتاہی کا دخل نہیں ہے، یہ اور اس طرح کی تمام باتوں پر غور کرکے ان کا تدارک لابد ہے۔

جناب اندر کمار گجرال کا وزیر اعظم ہونا ہندوستان کے لیے فال نیک ہے، اس کا عام طور پر پُرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے۔ بیرونی ملکوں اور پاکستان میں بھی خوشی ظاہر کی گئی ہے، وہ بڑے شریف، شائستہ اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں، جن کو موجودہ سیاستدانوں کے جوڑ توڑ، بے اصولی، بدعنوانی، جعل سازی اور موقع پرستی کی ہوا نہیں لگی ہے، وہ ایک راست باز ایماندار اور اصول پسند سیاست داں، اچھے اسکالر اور دانشور ہیں جن کا سیکولرزم پر پختہ عقیدہ ہے، بغیر جوڑ توڑ کے اس منصب پر فائز ہوجانا ان کی مقناطیسی شخصیت کا کرشمہ ہے، اگر وہ جوڑ توڑ کی سیاست اور سازش کا شکار نہ ہوئے تو ان کی تجربہ کاری، دور اندیشی اور سلامت روی سے ملک کا بھلا ہوسکتا ہے۔ وہ اردو نواز، اقلیتوں کے دوست مسلمانوں کے ہمدرد اور ان کے مسائل سے باخبر ہیں، اردو لسانی اقلیت کو خوشی ہے کہ گجرال کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے انہوں نے اردو کے فروغ و ترقی کے لیے جو سفارشات پیش کی تھیں وہ اب نقش و نگار طاق نسیاں نہ بنی رہیں گی۔

مقالات

مولانا حکیم سید عبدالحئی کی ادبی نکتہ سنجی و سخن فہمی
گل رعنا کی روشنی میں

از
ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

اصناف سخن

مولانا کے اردو کے نکتہ سنج ادیب و مبصر اور سخن فہم ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے مقدمہ اور اصل کتاب میں اردو شاعری کے بعض اصناف سخن کی خصوصیات وغیرہ بیان کرکے ان کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے ہیں، اس سے اردو شاعری پر ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے، ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

غزل کے متعلق ان کی رائے ہے کہ اس میں بے تکلف زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے، (ص۵۲) غزل میں سادگی کا خیال نہ رکھنے اور اس کی زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ کے بجائے ثقالت کو معیوب سمجھتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"بات یہ ہے کہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، مگر شروع ہی سے شعراء نے اس کو جذبات انسانی کے ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ بنالیا ہے، خواہ ان کا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا

دنیا کی بے ثباتی یا موت کا خیال یا اور کسی قسم کا جذبہ یہاں تک کہ اخلاق و مواعظ کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے، اسی لحاظ سے جب تک غزل کو جذبات انسانی کے ظاہر کرنے کا آلہ بنائے رکھو گے، غزل غزل رہے گی ورنہ نری لفاظی ہو گی"۔ (ص ۸۱)

اور غزل مسلسل کی تعریف اور فائدہ یہ بتایا ہے کہ:

"جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے، ایسی غزلوں کے لکھنے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، سفر کی روداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں جو دو ایک شعر میں نہیں سما سکتیں"۔

(ص ۳۶۵-۳۶۶)

عاشقانہ شاعری کی مولانا نے دو قسمیں بتائی ہیں، اول وہ جس میں عاشقانہ جذبات کی صحیح کیفیت حق شناس آنکھوں میں خدانمائی کا جلوہ دکھاتی ہے، اس کی حد ایک طرف تصوف یا معرفت یا عشق حقیقی سے ملتی ہے، دوسری طرف پاک محبت اور عشق مجازی سے ڈانڈا مل جاتا ہے"۔ (ص ۵۳)

تصوف کے رنگ کو شعر کی جان اور اس کے بغیر کلام کو روکھا پھیکا بتاتے ہیں۔ (ص ۵۲)

قصیدہ میں پُر شوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبوں کا استعمال ہونا چاہیے۔ (ص ۵۲)

مولانا تاریخ گوئی میں تعمیہ و تخرجہ کے معیوب سمجھے جانے کا ذکر کرتے ہیں مگر مومن خاں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ "ان کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا"۔

مصنف گل رعنا ہجو گوئی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

شاعری کے گلشن کا ایک خاردار پھل ہے مگر جس طرح سے گل کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح شاعرانہ جوش و خروش کی تکمیل میں اس کو بہت کچھ دخل ہے، اسی وجہ سے عربی اور فارسی کی شاعری بھی اس سے نہیں بچ سکی"۔ (ص ۵۰)

مرثیہ کے متعلق ان کا خیال ہے اور اپنے اس خیال کو وہ صحیح بھی بتاتے ہیں کہ "اردو شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی"۔ وہ کہتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حصہ کو اردو شاعری سے نکال لو تو پھر اس میں سوا خد و خال اور گل و بلبل کے کچھ نہیں رہ جاتا اور اردو شاعری کی تاریخ نامکمل رہے گی اگر اس میں اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

ریختی کا موجد وہ رنگین اور انشا کو نہیں مانتے، کیونکہ قدما کے ہاں بھی اس کا سراغ ملتا ہے، مولانا ہاشمی بیجاپوری طبقہ متقدمین کے دور اول کے مشہور شاعر ہیں، ان کی شاعری میں ریختی ملتی ہے۔ سید محمد قادری خاکی جو غالباً ولی کے ہم عصر تھے ان کے دیوان میں بھی ایک دو ریختیاں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے سوا اور کسی کا کلام اس طرح کا نظر سے نہیں گزرا، اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست سید انشا اللہ خاں کے حصہ کا تھا، جو ان کو حاصل ہوا۔ (ص ۵۵)

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف گل رعنا نے زبان کی صحت و صفائی، بیان میں گھلاوٹ اور لچک اور انداز بیان میں سادگی، اثر انگیزی، روزمرہ اور محاورہ کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے اور جو چیزیں ان میں مانع ہوتی ہیں ان کو چھوڑ دینے یا انہیں سلیقہ سے استعمال کرنے کی تاکید کرتے ہیں، یہاں ان کی ادبی نکتہ سنجی، سخن فہمی اور بلاغت شناسی کی خصوصیت کو واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تشبیہ و استعارہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

بعض مضامین ایسے دلچسپ و دلکش ہوتے ہیں کہ ان کو محض صفائی اور سادگی سے
بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان انکو
نہیں ادا کر سکتی اور معمولی اسلوب ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ایسے
موقعوں پر تشبیہ اور استعارہ یا کنایہ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے،
اگر ایسا نہ کیا جائے تو شعر شعر نہیں رہتا، معمولی بات چیت ہوجاتی ہے۔" (ص۲۰)

وہ تشبیہ و استعارہ کو ایک فطری چیز بتاتے ہیں، ایک عامی بھی جوش و خروش میں
غیظ و غضب کی حالت میں رنج و غم کی کوئی بات کہتا ہے تو بے ساختہ اس کے منہ سے
تشبیہ و استعارہ کے قالب میں ڈھل کر بات نکلتی ہے اور وہ سننے والے کے دل پر وہی
اثر پیدا کرتی ہے جو کہنے والے کے دل پر اس وقت طاری ہے۔ اس کی مثال بھی دی ہے
کہ اگر تم یہ کہنا چاہو کہ فلاں شخص بہادر ہے اور اسی لفظ سے ادا کر دو تو ادائے مطلب کا
یہ ایک معمولی طریقہ ہوگا اور اگر اسی بات کو یوں کہو کہ وہ شیر کے مانند ہے تو یہ تشبیہ ہوگی،
اور اس میں زور پیدا ہوجائے گا اور یوں کہو کہ وہ شیر ہے تو زور اور بڑھ جائے گا اور
اگر اس شخص کا نام نہ لو اور یوں کہو کہ میں نے ایک شیر دیکھا ہے اس سے مراد اسی شخص کو
لو تو یہ استعارہ ہے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے کہ شیر کا نام ہی
نہ لیا جائے بلکہ اس کے جو مخصوص اوصاف ہیں اس شخص کی نسبت استعمال کیے جائیں،
مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدانِ جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہلچل پڑ گئی تو یہ بھی
استعارہ ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ لطیف ہے۔ (ص۲۷)

مصنف گلِ رعنا تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اور استعارہ میں مستعار لہ
اور مستعار منہ میں کسی قسم کی مناسبت کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں خواہ ایک صفت میں ہو

یا چند اوصاف میں، حواس ظاہری سے محسوس ہوتی ہو یا عقل سے اس کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کو
وہ ایسی چیز بتاتے ہیں جس میں سلیقہ سے کام لینے کی حاجت ہے، شاعر اسی نکتہ کو پیش نظر
رکھے گا تو اس سے سلیقہ مندی ظاہر ہوگی اور اگر وہ بے اعتدالی سے کام لے گا تو اس شعر کو
سن کر بجائے اس کے کہ اس کے جوش و خروش کا دل پر اثر ہو، تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگی
اپنی طرف متوجہ کرے گی اور اس طرح سے اس کا مقصود فوت ہوجائے گا۔ (ص۲۲)

ایک جگہ اس پر مزید زور دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس میں شاعر کی سلیقہ مندی کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس کو صفت در صفت یا
استعارہ در استعارہ کر کے بعید الفہم نہ کر دے، دوسرے یہ کہ جس چیز کے ساتھ تشبیہ
دی جائے یا استعارہ کیا جائے وہ اس خاص صفت میں جس میں تشبیہ یا استعارہ مقصود
ہے کمال رکھتا ہو تاکہ اس کے ذکر کرتے ہی سننے والے کی طبیعت میں جوش اور اثر پیدا
ہو، تیسرے یہ کہ ان دونوں میں مناسبت پوری پوری پائی جائے۔" (ص۲۹)

متاخرین کے دور میں یہ خصوصیت پیدا ہوگئی جس پر مصنف نے اظہار تاسف کیا ہے،
کہ انہوں نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں
اعتدال سے گزر گئے اور ان باتوں کا کم لحاظ رکھا ہے، صفت در صفت اور استعارہ در
استعارہ کر کے کلام کو اتنے ایچ پیچ میں ڈال دیا ہے کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے
کھولتے مطلب غائب ہوجاتا ہے اور اکثر کوہ کندن و کاہ بر آوردن کی مثل اس پر ٹھیک
اترتی ہے۔ (ص۳۷)

یہی نہیں اس زمانے میں وہ بتاتے ہیں کہ قابلیت کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں
مخصوص صنعت مراعات النظیر پر آکر ٹھہر گیا تھا اور بعضوں نے اس رعایت لفظی کا پردہ اتنا

باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کے جھونکے سے ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئے" اور شاعری اچھا خاصہ سوانگ بن گئی (ص۶۹)

مصنف گل رعنا کو تشبیہ و استعارہ کی خوبی سے انکار نہیں وہ اسے بجائے خود نہایت عمدہ چیز مانتے ہیں، جس وقت گفتگو کا معمولی انداز جوش پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اسی کے ذریعہ سے کلام میں زور اور قوت پیدا کرنی پڑتی ہے، علاوہ اس کے یہ چیزیں کلام کو خوبصورت بھی کر دیتی ہیں جیسا کہ زیور سے حسینوں کے جمال میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے، مگر بقول آزاد یہ رنگ اگر اس حد تک رہے جیسا کہ چہرہ پر غازہ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوش نمائی اور بینائی دونوں کو مفید ہے اور اگر حد اعتدال سے گزر جائے تو اسکی شدت سے زبان خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بن جاتی ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں تشبیہیں اور استعارے قریب المآخذ ہوں یعنی پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں لطافت و نزاکت پیدا ہو جائے گی اور اگر دور پڑ جائیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت پیدا ہو جائے گی، اسی طرح اگر اس خاص صفت یا ان مخصوص اوصاف میں جن میں کسی چیز کو کسی سے تشبیہ دی گئی ہے یا استعارہ کیا گیا ہے، پوری پوری مناسبت نہ ہوگی تو کلام بدرنگ اور بے مزہ ہو جائے گا۔ (ص۷۲)

اردو شاعری پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اصل بھاشا کی آغوش سے نکل کر فارسی کی آغوش میں چلی گئی اور اسی کے الفاظ و خیالات اس پر چھائے ہوئے ہیں، مصنف گل رعنا اس کا اور اس کے سبب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چونکہ اردو شاعری کی ابتدا فارسی کی انتہا سے جا ملی ہے، لہٰذا بہت سے خیالات جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے ہیں، اس میں خود بخود آ گئے، مثلاً بجائے عورتوں کے

لڑکوں کا عشق، ان کے خط کی تعریف، شمشاد، نرگس، سنبل، سوسن، بنفشہ وغیرہ کی تشبیہیں، لیلیٰ، شیریں، شمع، گل، سرو وغیرہ کا حسن۔ مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری، پروانہ کا عشق، مانی و بہزاد کی مصوری، رستم و اسفندیار کی بہادری، زحل کی نحوست، سہیل یمن کی رنگ افشانی، نوروز کا جشن، جام جم، خم افلاطون، راہ ہفت خواں، کوہ بے ستون، کوہ الوند، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں سیحوں اور خدا جانے کیا کیا الفاظ، ترکیبیں اور خیالات فارسی سے اردو میں آ گئے۔

ان خیالوں اور اشاروں نے اردو شاعری کو سنگلاخ بنا دیا جس کی ماں بھاشا سی شیریں زبان تھی جو ہم کو وہ چیزیں بتاتی ہے جن کی کیفیت ان کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے مثال کے طور پر خیال کرو بارش کا موسم ہندوستان میں بہار کا موسم ہے، بادلوں کا گھر گھر آنا، سرد ہواؤں کا چلنا، سرسبز اور شاداب درختوں کا جھومنا، ہلکی پھواروں کا پڑنا، کوئل کا کوکنا، پپیہوں کا پی کہاں پی کہاں کی صدا لگانا یہ اور اسی قسم کی بہت سی دلکش باتیں ہیں جن کو دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے اور انہی باتوں کو اگر شعر کے قالب میں ایک خاص انداز سے ڈھالا جائے تو اس کو سن کر دلوں میں جوش اور طبیعتوں میں اتنی امنگ پیدا ہو سکتی ہے جو بہار فارس کو خواب میں نصیب نہیں۔

مگر بدقسمتی سے اردو شاعری میں گل و بلبل کا دخل ہوا جو متقدمین کے ہاں کم کم، متوسطین کے ہاں کچھ زیادہ پایا جاتا ہے اور متاخرین کی شاعری کا دار و مدار اسی پر ٹھہر گیا، تحسین و آفریں کی ہوس میں کبھی صفت در صفت، کبھی استعارہ در استعارہ سے اسے اتنا تنگ و تاریک کر دیا کہ شاعری گورکھ دھندا بن کر رہ گئی"۔ (ص۷۱)

یہ باتیں وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کا مذاق سخن بلند اور ادبی ذوق نہایت پختہ ہو، اور وہ شعر و بلاغت کا اداشناس ہو۔

شعراء کے بارے میں معنی خیز اور جچا تلا تبصرہ

مصنف گل رعنا نے مقدمہ میں بھی اور شعرا کے تذکروں کے ضمن میں بھی ہر ہر شاعر کے بارے میں جو نپا تلا اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کی خصوصیات اور امتیازات پوری طرح نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہ در اصل مصنف کے ادب و نقد ادب میں کمال اور سخن فہمی و شعر و بلاغت کی نکتہ شناسی کا نمونہ ہے مثلاً میر انیس اور مرزا دبیر کے متعلق انہوں نے بڑا بلیغ اور موثر تبصرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"ان دونوں نے مرثیہ گوئی کی صنف میں ایسی ترقی کی ہے کہ جس کے آگے قدم بڑھانا نظر بحالات موجودہ دشوار معلوم ہوتا ہے، ان لوگوں نے بھی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے اور مبالغہ کی تو حد کر دی ہے مگر باوجود اس کے زبان میں وہ لوچ اور وسعت پیدا کی ہے جو انہی کا حصہ ہے، ایک ایک مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے اور ہر قسم کے خیال کا ایسا طلسم باندھا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، صبح کا عالم دیکھو، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام غریباں، رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں، کبھی اندھیری راتوں کی ظلمت، دن کو کڑاکے کی دھوپ، لوؤں کی لپٹ، آفتاب کی آتش فشانی غرضیکہ قوت تخیل سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی شاعری سے اردو زبان کو گل ہائے رنگا رنگ سے مالا مال کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اردو زبان ہمیشہ ان کی منت پذیر رہے گی۔" (ص۹۷)

ایک اور جگہ مرثیہ میں جدتیں پیدا کرنے کے سلسلے میں ان دونوں بزرگوں کے کارنامے

بیان کیے ہیں:

"میر انیس و مرزا دبیر نے اس بنیاد پہ ایک بلند و مستحکم عمارت کھڑی کر دی، بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیے، ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا، مناظر قدرت کی ایسی تصویریں کھینچیں کہ فارسی شاعری میں بھی اس کا نمونہ بمشکل مل سکے گا، اسی طرح جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی کر کے اردو شاعری کو پستی سے بلندی پر پہنچا دیا۔" (ص۲۹)

ان دونوں بزرگوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شوکت الفاظ، مضامین کی آمد، اس میں جابجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنایے، المناک و دل گداز انداز جو مرثیہ کی اصلی غرض ہے، ان وصفوں میں وہ میر انیس سے ممتاز ہیں، کچھ شک نہیں کہ میر انیس زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتے، مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں، یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے ایسے عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک حریفوں کا طائر وہم بھی پرواز نہیں کر سکتا بقول مولانا شبلی خیال آفرینی، دقت بندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، نازک ادائی اور شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔

مگر میری رائے میں اس فیصلہ کا یہ مطلب نکالنا خطرناک غلطی ہے کہ مرزا دبیر زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری ہیں، یا میر صاحب قوت متخیلہ میں بالکل ہیٹے ہیں اور ان کے ہاں عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں نہیں ہیں، ایسا خیال کرنا ان دونوں بزرگوں کے دامن کمال پر دھبہ لگانا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ

ہر شاعر کا رنگ طبیعت انداز بیان اور طرز مذاق مخصوص قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک چیز ایک کے ہاں افراط سے ملے گی، دوسرے کے ہاں اس سے کم، یہی حال میر و مرزا کا بھی ہے اس سے نہ ان کی تنقیص کی جاسکتی ہے نہ ان کی۔ ع ہر طرز میں جو خوب ہے خوب وہ ہے"

صاحب ذوق سلیم کا قلم ہی یہ گل افشانیاں کر سکتا ہے، اس کے بعد ہی خواجہ آتش کے شاگرد نواب مرزا شوق کے بارے میں فرماتے ہیں! انہوں نے زہر عشق بہار عشق وغیرہ چند مثنویاں اس صفائی اور سادگی سے لکھی ہیں جو اخلاقی حیثیت سے کتنی ہی کم رتبہ ہوں مگر زبان اور بیان کے لحاظ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں، میر حسن اور انکی مثنوی پر ان کا یہ حقیقت و انصاف پر مبنی تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے ۔

" میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور اس سے بھی بہتر ان کی دوسری مثنوی سحر البیان ہے جس نے اتنی قبولیت حاصل کرلی تھی کہ آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی، اس مثنوی میں روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے علاوہ ربط کلام کی خوبی اور ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا گہرا تعلق ہے جیسا زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے اور مطالب ایسی صفائی سے ادا کیے ہیں کہ اگر ان ہی کو نثر کردیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ صاف اور مربوط نہ ہوگا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان کی بیان کی ہے وہ لفظاً و معنیً اس قدر عادت کے موافق ہے، جیسی فی الواقع ہوا کرتی ہے۔ غرض کہ جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ صفائی اور سادگی کے ساتھ اس قدر موثر اور دلگداز ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے" (ص۵۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

" میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہیں تھے، البتہ غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور

اور مثنوی میں تو یکتائے زمانہ تھے، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا، بے نظیر و بدر منیر کے قصہ میں جو سحر بیانی کی ہے اس کا آج تک جواب نہیں ہوسکا۔

اس کی زبان کی صفائی، محاورہ کا لطف، مضمون کی شوخی، طرز ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے، باوجود اس کے کہ سحر البیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو برس ہونے کو آئے ہیں لیکن اس کی زبان قریب قریب وہی ہے جو آج کل بولی جاتی ہے، یہی ایک اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ میر حسن کا مذاق سخن کتنا لطیف و پاکیزہ تھا" (ص۳۴)

اس کے بعد مرزا نسیم دہلوی کے متعلق سنیے انہوں نے اپنے استاد حکیم مومن خاں کی دقت پسندی کو دور کرکے ان کی نادر ترکیبوں کی مینا کاری کو اس قدر صاف اور روشن کردیا ہے جو قابل تحسین ہے۔

شاہ مبارک آبرو پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے، طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی، اس زمانہ کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام الجھا ہوا ہے، مگر محاوروں کی چاشنی نے اس کو بامزہ کردیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے کلام پر اس تبصرہ سے ان کی نکتہ دانی اور شعر فہمی کا اندازہ کیجئے!

" خصوصاً مرزا جان جاناں مظہر رحمۃ اللہ علیہ نے اس خارزار (تناسب لفظی و صنائع بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذو معنیین) کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری بن گئی، پھر اپنے زور طبع اور خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمونوں اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھے اسے سب بھول گئے" (ص۵۱)

میر محمد باقر حزیں پر تبصرہ اور نمونہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

"غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت معنی یاب و فکر رنگیں رکھتے تھے اور سوز و گداز کی چاشنی اس میں کسی سے کم نہیں ؎

خوب سوجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا   معتقد دل سے ہوا اس دل کی میں دانائی کا (ص۲۰)

شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد خواجہ محمد وزیر وزیر کے رنگ کو وہی بتاتے ہیں جو انکے استاد کا ہے "مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت، بیان کی متانت اور زبان کی صحت غرض پختگی کلام کے تمام لوازم اس میں موجود ہیں، لیکن غزل کی جان یعنی تاثیر کے نہ ہونے سے ان کے کلام کی حیثیت ایک حسین مگر جسد بے روح سے زیادہ نہیں قرار دیا سکتی، ان کے تمام دیوان کو اول سے آخر تک پڑھو اس میں دس شعر بھی ایسے نہ ملیں گے جن سے اہل دل کے قلوب کو سرور اور اہل نظر کی آنکھوں کو نور حاصل ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ جوان کا رنگ ہے اس میں ناسخ و آتش کے بعد ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کا مثل نہیں (ص۳۷۲)

سید ظہیر الدین ظہیر دہلی کے رہنے والے اور شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں استاد کے بجائے مومن خاں کا رنگ تھا، ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیت کلام کی پختگی، محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی کے ساتھ تعقید الفاظ کا عیب بھی ہے جو ظہیر کے یہاں نہیں پایا جاتا، مومن خاں کے یہاں شاعری کا مدار خیال کی نزاکت، ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے جو ظہیر کی شاعری کا سرمایہ ناز ہے، جہاں کہیں نزاکت خیال اور جدت اسلوب کے ساتھ الفاظ کی رنگینی اور ترکیب کی تازگی کی خوبیاں جمع ہوجاتی ہیں تو مرزا نسیم کی طرح دل پذیری کی شان ان کے کلام میں بھی پیدا ہوجاتی ہے اور جہاں کہیں استاد کا رنگ ہے" وہاں مرزا داغ اور ان کے کلام میں فرق کرنا دشوار ہے۔ غرض کہ مجموعی

حیثیت سے ظہیر کی شاعری دلی کی اصلی اور قدیم شاعری کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام میں نہیں مل سکتی (ص۲۲۹)

خواجہ احسن اللہ بیان اور ان کے کلام کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اصول شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے" ان کے کلام میں نمکینی اور رنگینی ایسی غضب کی ہے کہ شعر پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے، دور از قیاس استعارون اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک وصاف ہے اور سادگی میں بھی اس کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان کردی جائیں۔ (ص۱۹۶)

میر ضیاء الدین ضیا مرزا رفیع سودا کے ہم عصر تھے، ان کے کلام پر یہ ماقل و دل تبصرہ ملاحظہ ہو:

"اصناف سخن میں سے غزل کو پسند کیا تھا، قصیدہ اور مثنوی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوئی، سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا شوق تھا، جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں" (ص۲۱)

جعفر علی حسرت کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ" ان کے کلام میں ترکیبوں کی موزونیت، الفاظ کی برجستگی اور خیالات کی سادگی ان کے پیش رو شعراء کی طرح بہت نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ سارا کلام ان کا ایک طرح کا نہیں ہے، تاہم آزاد کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں کہ ان کے دیوان میں پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے" (ص۲۳) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کی زبان بہت پاکیزہ، طرز بیان نہایت صاف و سادہ، کلام میں رطب و یابس نہ ہونے کے برابر اور تصوف کا مذاق بہت ابھرا ہوا بتاتے ہیں جس کو بہت سادہ طریقہ سے ادا کرتے ہیں، تشبیہ اور استعاروں کی چاشنی کم ہے، جس سے کسی قدر پھیکا پن ظاہر ہوتا ہے،

تاہم رنگین شعروں کی بھی کمی نہیں ہے، سینکڑوں شعر ایسے انتخاب کیے جاسکتے ہیں جو دل نشین ہونے کے قابل ہیں (ص۲۳۵)

میر نظام الدین ممنون کے بارے میں یہ نپی تلی رائے لکھ کر اپنے مذاق سخن کی بلندی اور شعر فہمی کا ثبوت دیا ہے" زبان ان کی صاف اور شیریں ہے، اس میں جابجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزے دار ہو جاتا ہے، پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے" (ص۲۸۴) میر حسین تسکین پر یہ تبصرہ بھی اردو شاعری پر ان کی وسعت نظر اور شعر و سخن کا نکتہ داں ہونے کا ثبوت ہے۔

"کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن خاں کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے استاد کی طرز ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا" (ص۳۳۶)

مرزا اصغر علی نسیم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے:

"نسیم نے تمام اصناف سخن میں قدرت کامل پائی تھی خصوصاً مثنوی میں ان کو ید بیضا حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی اس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام لگا نہیں کھاتا۔

میری نظر میں وہ اپنے معاصرین اہل دلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنی طرز بیان کو

محفوظ رکھتے ہوئے اہل لکھنؤ کی متروکات کو قبول کرنے میں پیش قدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے بھی اس کی داد دی اور یہاں رہ کر اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا" (ص۳۹۳)

میر مظفر علی خاں اسیر کو پُرگو، کہنہ مشق اور تمام اصناف سخن پر قدرت رکھنے والا کہنے کے باوجود اپنے ہم عصروں کی طرح لفظی رعایتوں کا اسیر بتاتے ہیں (ص۳۹۵) متاخرین کے دور میں جب قابلیت کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں مخصوص صنعت مراعات النظیر پر آکر ٹھہر گیا تھا تو اس زمانے میں امانت کی شاعری کا دار و مدار اسی ضلع جگت پر تھا مشکل سے کوئی صاف شعر ان کے ہاں مل سکتا ہے، خصوصاً واسوخت کی شہرت کی بنیاد اسی پر تھی۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب کے بچپن میں اس کی بڑی دھوم تھی، مولانا نے ایک بند اور چند اشعار نمونہ کے طور پر نقل کیے ہیں (ص۴۰۱)

نواب سید محمد خاں رند کے بارے میں اس تاثر کا اظہار فرمایا ہے، بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ کی شاعری کا مدار مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت پر ہوا کرتا ہے، ان کے ہاں تینوں چیزیں کمزور ہیں، بلند پروازی اور خیال آفرینی میں خواجہ وزیر اور زبان کی صحت میں میر صبا کو یہ نہیں پہنچتے مگر ان کے ہاں سادگی اور صفائی اور تاثیر کا سا ہلکا رنگ نظر آتا ہے جس سے خواجہ وزیر محروم ہیں اور صبا کے یہاں کچھ کچھ پایا جاتا ہے (ص۴۰۸)

بات تقابل کی آگئی تو چند ہم عصر شعراء کے متعلق گل رعنا کے مصنف کی گہر افشانیاں ملاحظہ کریں کہ شاعری پر ان کی استادانہ و ماہرانہ نظر، ذوق ادب کی بلندی اور سخن فہمی کا تماشا دیکھ لیں!

میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد اور میر سوز وغیرہ ہم عصر طبقہ متوسطین کے دور اول کے سرخیل اور اردو شاعری کے اساطین میں تھے، پہلے ہم انہی حضرات کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے اور ہر ایک کے الگ الگ طرز و خصوصیت کو بیان کرتے ہیں:۔

مرزا رفیع سودا قصیدہ کے میدان میں فارسی شعراء سے بھی بعض باتوں میں آگے بڑھ گئے ہیں، ان کے کلام کا زور و شور انوری کے کلام سے نہیں دبتا اور نزاکت مضمون میں عرفی کو بھی شرماتا ہے، وہ ہجو کے بھی مرد میدان ہیں، گرمی کلام کے ساتھ شوخی و ظرافت ان کے حصہ میں آئی ہے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی، مرثیہ کو مسدس کیا جس سے اس میں وسعت پیدا ہوگئی۔ قصیدوں میں پُرشوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبیں استعمال کیں، عاشقانہ مثنویاں جس شان کی میر تقی میر نے لکھی ہیں ان کی نظیر اس دور سے پہلے نہیں ملتی۔

غزلوں میں بے تکلف زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انہوں نے کی اسکی نظیر قدماء کے کلام میں نہیں مل سکتی، میر تقی میر، میر درد، یقین، بیان، حزیں، ہدایت اور بیدار کی غزلیں پڑھو اور اپنے دل پہ ہاتھ دھر کر دیکھو۔

جوش و خروش، کلام کی گرمی اور دل آویزی، دلچسپ اور دل پسند بحروں میں . . . پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف اور قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو مرزا رفیع سودا اور قائم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو . . . اگر روزمرہ اور محاورے میں بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا ہو تو میر تقی میر، میر درد اور میر سوز کی غزلیں پڑھو جس پہ ہزاروں طرح کی بناوٹیں قربان ہوتی نظر آئیں گی۔ . . تصوف کو خواجہ میر درد سے پہلے سراج

کے سوا کسی نے چھوا ہی نہیں، اس کی آمیزش سے جو تڑپ ان کے کلام میں پیدا ہوگئی ہے اس کا اترا ہوا خاکہ بھی ان کے پیش روؤں میں نظر نہیں آتا (ص ۵۲-۴۹)

آزاد کے حوالہ سے سودا کے کلام پر جو رائے زنی کی ہے اس سے بھی ان کی سخن فہمی اور شعری خوش مذاقی عیاں ہے، لکھتے ہیں:۔

"ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز، نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں، چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعراء سے ممتاز معلوم ہوتا ہے، اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں، کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس در و بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چانپیں چڑھی ہوتی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے، چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں، شعر مزا ہی نہیں دیتا، خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے، تشبیہ و استعارے ان کے ہاں ہیں مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ، رنگینی کے پردہ میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہوتے دیتے" (ص ۱۴۱-۱۴۰)

میر صاحب کو غزل کا بادشاہ بتایا ہے، قصیدہ کے مرد میدان نہیں، ان کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجہ میں کم ہیں، واسوخت لاجواب ہیں۔ (ص ۱۶۵)

خواجہ میر درد کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے، قصیدہ کی طرف مائل نہیں

ہوئے، اس واسطے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے، اس کو بھٹی سے کیا نسبت' غزلوں کا دیوان بقول میر حسن کے مثل دیوان حافظ کے سراپا انتخاب ہے، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر و مرزا کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔ (ص۱۷۱)

سید محمد میر سوز کے متعلق آزاد کی اس رائے کو بے لاگ بتاتے ہیں کہ ان کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے، ان کی انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے' البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے (ص۱۸۲)

طبقہ متوسطین کے دور سوم کے شعرا میں ذوق اور ظفر کو روزمرہ محاورہ بندی میں سب سے فائق بتایا ہے (ص۵۹) مومن اور غالب کے ہاں خیال آفرینی کے ساتھ فارسی کی ترکیبیں زیادہ داخل ہوگئی ہیں اور بول چال کا لطف ذوق و ظفر کی نسبت ان کے ہاں کم ہے، اس دور میں نصیر نے مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی اور بعید الفہم استعاروں سے کام لے کر اور مشکل و سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر اس کو تنگ و تاریک کر دیا ہے، اگرچہ ان کے ہاں بھی محاورہ جہاں آجاتا ہے شعر میں تڑپ پیدا کر دیتا ہے مگر بیشتر حصہ ان کے کلام کا بے لطف و بے رنگ ہے' ذوق کے کلام میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے، ممنون، مومن' غالب اور ان کے متبعین تسکین و شیفتہ کے ہاں تازگی خیالات کے ساتھ فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے، خصوصاً مومن اور غالب نے جہاں بے اعتدالی سے کام لیا ہے وہاں ان کا کلام رتبہ سے بہت گر گیا ہے، انھوں نے اور ان کے متبعین نے

معمولی معمولی مضمون کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے جو سب سے نرالا ہے (ص۵۹)

بعض موقعوں پر شاہ نصیر کے استعارہ یا تمثیل پر پھبتی کا دھوکا ہوتا ہے، البتہ ذوق نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کیے ہیں اور ان سے بہت زیادہ حکیم مومن خاں اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی ہے اور بعض مقاموں پر جدت سے بھی کام لیا ہے (ص۶۱) شاہ صاحب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں (ص۲۷۹) ذوق کے متعلق وہ آزاد کی اس رائے سے متفق ہیں کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون' صفائی کلام' چستی ترکیب' خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے مگر رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا (ص۲۸۵) مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے' قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں (ص۳۰۴)

مرزا غالب کے اہم خصوصیات و امتیازات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مرزا نے اپنے تغزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہے جن کو اور شعراء کی فکر نے مس تک نہیں کیا، وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے، یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک مضمون ان کا نیا ہی ہو۔

۲۔ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ان سے جہاں تک ہو سکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں۔

۳۔ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں، سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے بڑھ کر

ہیں مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں تو متانت ان کے ہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

۴۔ مرزا کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو مومن کے سوا اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں ان سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔

سید انشا کے معاصر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان کے کلام میں کہیں میر کا درد ہے، کہیں سودا کا انداز، کہیں سوز کی سادگی اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور استادی اپنے پیش رو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں، اس مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میر و مرزا کے بعد کوئی استاد ان کے مقابلہ میں نہیں جنچتا اور یہ اپنے ہم عصروں میں سب سے برتر اور فائق نظر آتے ہیں۔ مصحفی پر انشا کو ترجیح دینے کی آزاد کی کوشش کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں انشا کی ذہانت اور طباعی میں کچھ شک نہیں مگر سخن سنجی اور مشاقی کے لحاظ سے انشا کو مصحفی کے مقابلہ میں لانا ہی مصحفی کی سخت توہین کرنا ہے، بذلہ سنجی اور ظرافت کے زور سے شاہ و وزیر کے دربار میں رسوخ حاصل کر لینا یا زبان آوری اور طباعی کی مدد سے مجلسوں کو گرما دینا اور چیز ہے اور اصول فن کو لیے ہوئے اصناف سخن میں سے ہر صنف پر قدرت کامل رکھنا اور سخن سنجی کا حق پورا پورا ادا کرنا اور بات ہے، یہی وجہ ہے کہ انشا کی گرم بازاری انہی کے ساتھ ختم ہو گئی اور مصحفی کے کمال کا سکہ اب تک رائج ہے (ص۲۲۲)

مصنف گل رعنا کو اس کا سخت افسوس ہے کہ مصحفی جیسے باکمال شاعر کی جتنی قدر ہونی

چاہیے تھی لکھنؤ میں نہیں ہوئی وہ ان کی عظمت اور قادر الکلامی کے بڑے معترف ہیں، ان کے کمال فن کے ثبوت میں دو باتیں بطور خاص تحریر فرمائی ہیں:

(۱) جتنے استاد ان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے، شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں، شیخ امام بخش ناسخ کو گو انکار ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی بواسطہ یا بلاواسطہ انہی کے مائدۂ سخن کے ریزہ چیں تھے، خواجہ حیدر علی آتش، میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر وغیرہ اس پایے کے لوگ ہیں جن کے دامن تربیت میں پرورش پاکر سینکڑوں استاد بن گئے، سب کو جانے دو میر خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور میر ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر کو لو جنھوں نے ہندوستان میں سخنوری کے ڈنکے بجائے ہیں اور اردو شاعری کو معراج کمال تک پہونچا دیا ہے۔

(۲) ان کی مشاقی و استادی کا ثبوت خود ان کا کلام ہے جو آٹھ دیوانوں میں مشکل سے سما سکا ہے، اگر یہ سچ ہے کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے تو جتنا موجود ہے اس کا سوایا اور رہا ہوگا پھر اگر ان کے سارے دیوانوں میں سے صرف وہی اشعار چھانٹے جائیں جو ہر طرح سے بلند رتبہ ہیں تو انشا کے مجموعہ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ ان کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے (ص۲۳۵)

اس کے مقابلے میں ان کے حریف سید انشا کے بارے میں مصنف گل رعنا کا خیال ہے کہ ان کے کلام میں کچھ ناگوار الفاظ اپنے ہم عصروں سے زیادہ ملتے ہیں، وہ ہر جگہ دھینگا مشتی کرتے ہیں، کہیں آزادوں کے لہجہ میں بولنے لگتے ہیں، کہیں رنڈیوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، کبھی پورب میں ہیں، کبھی پچھاں میں اور کسی جگہ ان کا رفیق زندگی یعنی تمسخر ان سے

جدا نہیں ہوتا (ص۵۳) اس کے باوجود مصنف گل رعنا کی حق و انصاف پسند طبیعت انکے جائز کمال کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتی، ملاحظہ ہو:

"بلا کے ذہین و ذکی تھے، تھوڑے دنوں میں فارسی، اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کرلی، طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی، شاعری کی طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے، عربی، فارسی اور ریختہ تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، بہاء الدین آملی کی نان وحلوا کے جواب میں شیر و برنج تیار کی جو حقیقت یہ بہت مزیدار ہے، نواب سعادت علی خاں کے شکار کا حال ایک مثنوی میں لکھا ہے وہ بہت اچھی ہے۔ مگر زیادہ توجہ ریختہ کی طرف رہی اور اخیر اخیر میں اسی کو اپنے فضل و کمال کا جولان گاہ قرار دیا" (ص۲۵۶-۲۵۷)

امیر و داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ کا تقابلی مطالعہ بھی ملاحظہ ہو۔

سچ یہ ہے کہ امیر و داغ اس دور آخر میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا تو دوسرا بیان کی شوخی اور معاملہ نگاری پر فریفتہ۔ امیر کے ہاں نازک خیالی کے ساتھ شکوہ الفاظ کی چاشنی بھی ملی ہوئی تھی اور مزہ یہ ہے کہ اس میں دقت پسندی کو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے، اہل فن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن کے مسلم الثبوت استاد تھے، وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر و انشا کے لیے موزوں تھی، انہوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس پر کلام کا زور، مضمون کی نزاکت سے ہر جگہ دست و گریباں ہے، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستگی، لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جوڑتے ہیں، خیالات نازک اس طور پر باندھتے ہیں کہ اس باریک نقاشی پر فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے (ص۴۰) داغ نے غزل کی زبان میں نہایت صفائی، وسعت

اور بانکپن پیدا کردیا ہے، ان کے ہم عصروں میں کوئی بھی زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاوروں کی روانی میں ان کا مثل نہیں، روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ طرز ادا کی شوخی اور بانکپن داغ کا حصہ ہے، غزل میں ان کو سب پر مزیت ہے (ص۸۰)

نواب مرزا داغ کا یہ حال بھی پڑھیے، حریف، ظریف، خوش طبع، رنگین مزاج زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو دیکھو فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے، حسن وعشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات، گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو سن کر عوام سر دھنتے ہیں اور خواص مزہ لیتے ہیں۔ (ص۴۲۰ و ۴۲۱)

حکیم ضامن علی جلال کی زبان اور طرز ادا کو لکھنؤ کی روزمرہ اور طریقہ بیان کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے، طرز ادا میں ایک قسم کا لوچ جو اہل زبان کے ساتھ مخصوص ہوا کرتا ہے، جلال کے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے، غزل میں داغ کے بعد ان کو سب پر مزیت ہے (ص۸۰) امیر اللہ تسلیم الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دلآویزی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور مثنوی میں ان کو جو مرتبہ حاصل ہے اس میں ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں، قصیدے میں بھی کچھ کم نہیں، تشبیہوں اور استعاروں کی برجستگی میں محسن کا کوئی ہم پلہ نہیں، جس زور و شور کے قصیدے لکھے وہ انہی کا حصہ ہے (ص۸۱) عام جوہر ان کے کلام کا مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندش کی چستی، استعاروں کی رنگینی اور قصہ طلب تلمیحات ہیں جس میں ان کے معاصرین میں کوئی ان کا شریک نہیں، بلکہ اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں (ص۴۵۶) راقم نے بے شمار مثالیں جمع کردی ہیں، اور ابھی مزید اور بھی جمع کی جاسکتی ہیں، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے ہی سے اندازہ

ہوجاتا ہے کہ گلِ رعنا کا مصنف شعروادب کا بڑا عمدہ اور اعلیٰ ذوق رکھتا تھا وہ لکھنؤ اور دہلی اسکول کی خصوصیات اور ان کے طرز و انداز سے باخبر تھا، اردو شاعری میں بالغ نظر تھا اور اس نے اس کا دقت نظر اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا اور اسے خدا نے شعر فہمی اور کلام کی خوبی، لطافت، نزاکت، جاذبیت و تاثیر اور اچھے برے کی تمیز کا فطری ملکہ بخشا تھا اور وہ اچھے شعروں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

ہر دور کے کلام کی خوبی و خرابی سے واقفیت | یہ پہلے گزر چکا ہے کہ گلِ رعنا میں اردو شعرا کے تین طبقات قائم کیے گئے ہیں، متقدمین، متوسطین اور متاخرین۔ پھر ان تینوں طبقوں کو تین تین دور میں تقسیم کیا ہے، مصنف نے اپنی شعری و ادبی بصیرت و واقفیت اور شاعری کی تاریخ پر وسعت نظر اور شعر و سخن کے فطری اور خداداد ملکہ کے نتیجے میں ہر طبقہ کے ہر دور میں ہو[illegible] لی زبان کی اصلاح و ترقی کا عالمانہ و مبصرانہ اور ناقدانہ و محققانہ جائزہ لیا ہے، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

طبقہ متقدمین میں پہلے دور میں ان شاعروں کو بتایا ہے جن کی نشوونما حیدرآباد اور بیجاپور میں ہوئی، اس دور میں اردو زبان عالم طفولیت میں تھی، دکنی الفاظ کثرت سے اس میں پائے جاتے ہیں، شمال ہند کے رہنے والوں کو ان کے اشعار کا بیشتر حصہ سمجھ میں نہیں آسکتا، اس دور اور دوسرے دور کے طریقہ بیان میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے، سیدھے سادے انداز سے پیش پا افتادہ مضامین کو نظم کر دیا ہے ... دوسرے دور کے شعرا کی زبان منجھتے منجھتے بہت صاف ہوگئی ہے تاہم دکن کا لب و لہجہ اور کہیں کہیں الفاظ و روابط جو اہلِ دکن کے ساتھ مخصوص ہیں، ان لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں (ص۲۷) ان دونوں دور کے شاعروں کا انداز بیان بہت صاف و سادہ ہے جو کچھ آنکھوں کے

سامنے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں، ایچ پیچ کے خیالات دور دور کی تشبیہیں نازک استعارے نہیں بولتے۔ اسی واسطے اشعار صاف و بے تکلف ہیں (ص۱۲) اس طبقہ کے تیسرے دور میں شعرائے دلی شامل ہیں، انکے کلام میں بھی وہ الفاظ و روابط پائے جاتے ہیں۔ خلاصہ بحث کے طور پر فرماتے ہیں کہ بہرحال متقدمین کے خیالات میں ندرت نہیں ہے تو نہ ہو مگر ان کا انداز بیان بہت بے تکلف اور سیدھا سادا ہے اس میں شعرائے دکن و دلی میں باہم امتیاز نہیں (ص۴۲)

طبقہ متوسطین کے ہر ہر دور پر زیادہ تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور اس میں زبان کی اصلاح و صفائی، متروک الفاظ کی فہرست اور ہر ہر دور کی خصوصیات وغیرہ کا ایسا مرقع پیش کیا ہے جس سے اس کی خوبی و بے اعتدالی اور اسلوب بیان کی ندرت و جدت وغیرہ اچھی طرح نمایاں ہوگئی ہے۔

طبقہ متوسطین کے پہلے دور میں مرزا مظہرؔ، مرزا رفیعؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ، قائمؔ، یقینؔ، بیانؔ، حزیںؔ، ہدایتؔ، قدرتؔ، بیدارؔ، ضیاؔ، ممتاز شعرا شامل ہیں، اس دور کے جو کارنامے اور خصوصیات بتائے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے:

۱۔ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش، بہت سے الفاظ و روابط جنھیں ولی اور اس کے ہم عصر بے تکلف کلام میں لاتے تھے نکال ڈالے تاہم کچھ اجنبی اور نامانوس الفاظ رہ گئے جیسے کیا کیا بجائے کس کس۔ ان نے بجائے اس نے، بھر نظر بجائے نظر بھر کے، دل اپنے کے بجائے اپنے دل کے، مجھ آنسو بجائے میرے آنسو، جس تس نے بجائے جس کسی نے، ایدھر اودھر بجائے اِدھر اُدھر، کہنے لاگا بجائے کہنے لگا، دیوانہ بیگانہ کے بجائے دیوانہ و بیگانہ، رقیباں بجائے رقیبوں کے انکھڑیاں، آنکھوں کی جگہ، سجن معشوق

معنوں میں 'پیچ' اندر کے معنوں میں 'دم کھا رہو، سانس نہ لو یعنی چپکے رہو' وغیرہ۔

۲۔ دل پذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انہیں کہیں ترجمہ کرکے اور کہیں بجنسہ لے لیا ہے مثلاً تر دامن، پنبہ دہن، آتش زیر پا، دامن کوہ، گردن مینا دست سبو، سرو آزاد اور اسی طرح سینکڑوں الفاظ اور محاورے ہیں جنھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا۔

۳۔ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھتے چلے آتے ہیں ان کو بہ تبدیل الفاظ و بہ تغییر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیے اور مزے لیجیے، ان کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز و دلکش ہیں۔ مذکورہ بالا شعراء کے کلام سے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔

۴۔ اعتدال کے ساتھ تشبیہ و استعارہ سے کام لیا، صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا کہ شعر سن کر اس کی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تشبیہ و استعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا، یہی بات ان کی شاعری کی جان ہے۔

۵۔ سب سے پہلے اسی دور کے شعراء نے قصائد دھوم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچا دیا، عاشقانہ مثنویاں جس شان کی لکھی ہیں اس کی نظیر اس دور سے پہلے نہیں ملتی، چو مصرعے مرثیہ کو مسدس کیا جس سے اس میں وسعت پیدا ہوگئی، مرثیے واسوخت میں طبع آزمائی کی اور اس میں کمال دکھایا، ہجو گوئی کی ایسی نظیر

پہلے نہیں ملتی، مخمس، مربع، مثلث اور مستزاد غرض کہ جتنے اصناف سخن ہیں سب میں طبع آزمائی کی اور اردو شاعری کو ہر طرح مکمل کر دیا۔

۶۔ تناسب لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذو معنیین جو قدماء کی شاعری کا مایہ ناز ہیں ان کے دور کرنے میں بڑی کوشش کی اور اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

۷۔ اصناف سخن میں ہر چیز کو پورے سلیقہ سے بیان کیا، قصیدوں، غزلوں میں جس طرح کے الفاظ، زبان، ترکیبیں، محاورے، روزمرہ اور مضامین و خیالات ہونے چاہئیں ان کو برتا اور کلام میں جوش و خروش، گرمی، تڑپ سوز و گداز اور دلآویزی پیدا کی اور دلچسپ اور دل پسند بحریں اختیار کیں۔ (ص ۴۲-۵۲)

متوسطین کے دوسرے دور میں شیخ غلام ہمدانی، میر غلام حسن، حسن، شیخ قلندر بخش جرأت اور میر انشاء اللہ خاں انشا وغیرہ کے نام ہیں، اس دور کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ ان لوگوں نے زبان کی صحت اور صفائی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بہت سے ناگوار الفاظ و روابط نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہوگئی، تاہم پھر بھی کچھ الفاظ باقی رہ گئے، سید انشا کے کلام میں کچھ ناگوار الفاظ ہم عصروں سے زیادہ ملتے ہیں۔

۲۔ طرز بیان میں کوئی حسن و خوبی نہیں پیدا کی، ان ہی پھولوں سے گلدستے تیار کیے جو ان کے پیش رو جمع کر چکے تھے، صرف اتنا کیا کہ شوخی و ظرافت کے ساتھ عاشقانہ شاعری میں حقیقت کے منہ سے نقاب کو ہٹا کر مجاز کو زیادہ نمایاں کیا۔ پاک اور بے لوث عشق کی جگہ ہوس پرستی کے جذبات کی تصویر کھینچی، جرأت، انشا اور رنگین نے ترقی دے کر

اس ناپاک طریقہ کی بنیاد ڈالی جس پر متاخرین نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں اور یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال دم بخود ہو کر رہ گئے۔

۳۔ ان کی رنگین طبیعت نے ریختہ سے ریختی کے شاخسانے کھڑے کر دیے، اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست سید انشاء اللہ خاں کے حصہ میں آیا۔

۴۔ اس عہد کا بہترین کارنامہ میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اور میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور اس سے بھی بہتر ان کی دوسری مثنوی سحر البیان ہے جس کی خصوصیات پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ (ص ۵۶-۵۳)

اسی طبقہ کے تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور یہ خصوصیات بیان کی ہیں:

۱۔ سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے ان کو انہوں نے دور کر کے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ فارسی زبان کی نہایت لطیف اور خوش نما ترکیبوں سے اردو میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر دی۔

۲۔ ولی سے مصحفی تک عموماً انداز بیان میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے اس دور میں مضمون آفرینی کی بنیاد پڑی، زبان کا چٹخارہ، تازگی خیالات اور فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے۔

۳۔ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرنے کے باوجود شعر کی لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

۴۔ میر و مرزا سے لے کر مصحفی تک کے شعراء کا ایک محدود دائرہ ہے جس سے وہ بہت کم نکلتے ہیں، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلے کے بندھے ہوئے مضمون کو ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے مگر اس دور کے شعراء میں سے مومن و غالب اور ان کے متبعین نے معمولی معمولی مضمونوں کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے جو سب سے نرالا ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد ایک دوسرے ہی نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انکا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے اور اس کے بار بار پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی۔ ان کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور بھی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں، جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقع ہوتے ہیں جہاں سُننے والوں کا ذہن خود بخود اس جز کی طرف منتقل ہو سکتا ہے (ص ۶۲-۵۷)

متاخرین کا پہلا دور ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا ہے، اسکی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ سب سے بڑا کارنامہ زبان میں تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ نکال دینا ہے، ناسخ و آتش کے یہاں جو الفاظ رہ گئے ہیں وہ عجب نہیں کہ ان کا ابتدائی کلام ہو۔

۲۔ زبان کو صاف کرنے پر بھی غزل میں سادگی کا خیال نہیں رکھا، ایسی صنفِ لطیف میں عربی الفاظ رفتہ رفتہ کثرت سے داخل ہو گئے زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ آنے کے بجائے وہ زیادہ ثقیل ہو گئی۔

۳۔ صنائع و بدائع کو قابلیت کا معیار بنا لینے سے شاعری اچھا خاصا سوانگ بن گئی۔

۴۔ تشبیہ و استعارہ میں حد اعتدال سے تجاوز کرنے سے زبان خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بن گئی، کلام بدرنگ اور بے مزہ ہو گیا اور شاعری گورکھ دھندا ہو گئی۔

۵۔ شاعری کے فطری اور لطیف جذبہ کو ضلع جگت کے ساتھ فحش اور گندے مضامین سے ناپاک کر دیا، قبول عام حاصل کرنے کو جامہ عریانی اختیار کر کے بے پردہ مضامین، بتذیانہ محاورے اور مبتذل الفاظ سے کلام کو پستی کی انتہائی حد تک پہنچا دیا اور ایسا رنگ اچھلا کہ ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی کبیر مات ہو گئی۔

۶۔ البتہ اصلاح زبان کے لیے مساعی جمیلہ کر کے مفید خدمت انجام دی (ص ۶۶-۷۹)

متاخرین کے دوسرے دور یعنی داغ و امیر کا بھی اسی حیثیت سے مکمل جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں یہ مبصرانہ رائے قابل ذکر ہے۔

"خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعرا کا کلام پڑھو تو ان میں کسی طرح کی تازگی نہ پاؤ گے، وہی گل و بلبل کی داستان، شمع و پروانہ کا قصہ، لیلیٰ و مجنوں کی کہانی، جفائے یار، رشک اغیار، شوق وصل، رنج و فراق، زلف پریشاں، چشم فتاں، نرگس بیمار، سیب زنخداں، رندی و بادہ خواری اور زاہدوں پر طعن و تعریض کے مضامین کو الٹ پھیر اور ردیف و قافیہ کے ادل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کر لی ہیں، چاہو تو اسی کو ان کی شاعری کا کمال سمجھ لو کہ ان کے اساتذہ نے جن مضمونوں کو اپنے خاص انداز سے باندھا ہے انہوں نے اس میں فی الجملہ صفائی اور سادگی پیدا کر کے شکل بدل دی ہے یا یوں سمجھو کہ سانچہ بدل دیا ہے، پہلے جو چیز ایک شکل پر ڈھلی تھی وہ اب دوسری شکل پر ڈھل گئی ہے، جس میں بہ نسبت شعرائے دور اول کے کلام کسی قدر صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے۔" (ص ۸۱)

گل رعنا کے مقدمہ میں عہد بعہد اردو شاعری میں ہونے والی ان اصلاحات و تغیرات کو بڑی تفصیل سے مثالیں دیکر سمجھایا ہے جس کو پڑھنے کے بعد اردو شاعری پر ان کی گہری نظر اور شعر و سخن کی ان کی مزاج شناسی اور سخن فہمی و نکتہ سنجی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

عباسی عہد کا مشہور زہدیہ شاعر۔ ابو العتاہیہ

از جناب عبد الجبار صاحب علی گڑھ

نام، وطن اور نسبت ابو اسحٰق اسمٰعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان العنزی کی پیدائش ۱۳۰ھ میں عین التمر میں ہوئی، جو مورخین عین التمر کو حجاز کا حصہ مانتے ہیں وہ ابو العتاہیہ کو عربی الاصل بتاتے ہیں اور جو اس کو عراق کا ایک علاقہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک ابو العتاہیہ عربی الاصل نہیں ہے۔

عنزی کہے جانے کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ جب ۱۲ھ میں حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں یہ علاقہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے فتح کیا تو ابو العتاہیہ کے جد امجد کیسان بھی قیدی بن کر آئے جن کو حضرت ابو بکرؓ نے عبادہ بن رفاعہ العنزی کو دیدیا مگر انہوں نے ان کو آزاد کر دیا تھا، اس طرح یہ ولاء کے اعتبار سے عنزی کہلانے لگے۔[1]

ابو العتاہیہ کی وجہ تسمیہ صاحب اغانی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ مہدی نے کسی بات پر غصہ ہو کر اس سے کہدیا تھا کہ " اَنتَ انسان متخذلق مُعتَّہٌ " (تو بے حیا مجنوں اور آوارہ گرد انسان ہے) اسی وقت سے لوگ اسے ابو العتاہیہ کہنے لگے اور یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام اور کنیت پر غالب آگیا۔[2]

نشوونما اس امر پر اتفاق ہے کہ ابو العتاہیہ عین التمر میں ۱۳۰ھ میں اموی خلافت کے

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ: ج ۴/ ص ۴۴۰ [2] اغانی۔ ابو الفرج الاصبہانی ج ۴/ ص ۴۔

خاتمہ سے دو سال قبل پیدا ہوا، لیکن اس کا خاندان کوفے میں کب منتقل ہوا اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ غالب گمان یہی ہے کہ ۱۳۲ھ میں جب عباسی خلافت قائم ہوئی اور ابو العباس السفاح نے کوفہ کو دار الخلافہ بنایا تو لوگ وہاں آکر آباد ہونے لگے۔

اس زمانے میں علماء و فضلاء کے علاوہ ہنرمند اور پیشہ ور لوگ بھی کوفہ میں وارد ہوئے، ابو العتاہیہ کے والد مٹی کے برتن بنانے کی صنعت اور حجامت سے واقف تھے اس لیے وہ بھی کوفہ آکر آباد ہوئے، اس کی وجہ سے ابو العتاہیہ کی نشو و نما یہیں ہوئی۔

اور جب وہ سن شعور کو پہونچا تو اس کا بھی میلان خاندانی پیشے کی جانب ہو گیا اور وہ گھر والوں کے ہاتھ بٹانے اور کوفے کی گلی کوچوں میں مٹی کے برتن بیچنے لگا، ممکن ہے اس کے اس پیشہ کی بنا پر لوگوں نے اس کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا ہو اور سماج میں اس کو کمتر سمجھا گیا ہو، اسی لیے آگے چل کر اس نے اپنی شاعری میں حسب و نسب پر تقویٰ پرہیزگاری اور زہد کی فضیلت و برتری دکھائی ہے چنانچہ کہتا ہے کہ:

الا انما التقویٰ ھی العز والکرم وحبک للدنیا ھو الفقر والعدم

ولیس علیٰ عبد تقی نقیصۃ اذا صحح التقویٰ وان حال او حجم[1]

(تقویٰ ہی میں اصل عزت و کرامت ہے، دنیا کی حرص و محبت میں فقر و محتاجی کے سوا کچھ نہیں ہے اور ایک متقی و پرہیزگار آدمی کے لیے یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ وہ برتن بناتا یا حجامت کرتا ہے)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاندانی وجاہت سے محرومی اور پیشے کی حقارت کا شاعر کو اس قدر احساس تھا کہ اس کا رجحان زہدیہ شاعری کی جانب ہو گیا۔

معاشرہ میں پستی کے اسی احساس نے ابو العتاہیہ کے دل میں شدت اور تلخی پیدا

[1] اغانی: ابو الفرج الاصبہانی / ج ۴ / ص ۔۔

کر دی تھی اور وہ ارباب دولت و ثروت اور حکمراں طبقے سے نفرت کرنے لگا تھا جس کا اظہار اس نے اپنی زہدیہ شاعری میں کھل کر کیا ہے۔

افلاس اور غربت نے شاعر کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ زبان کے نوک پلک سے آشنا ہوتا اور متقدمین کلاسیکل شعراء کے کلام کا درس لیتا اور مطالعہ کرتا، اس کی وجہ سے کلام کا انداز سہل اور سادہ ہے جو زمانے کے بدلتے حالات کا تقاضا بھی تھا، اسی لیے ابو نواس جیسے اہم شعراء بھی اسی انداز کو اپنا کر مقبول ہوئے۔

ابو العتاہیہ کو شعر و سخن کا خداداد ملکہ تھا، اس کی وجہ سے بہت جلد اس نے بڑے بڑے شعراء کی مجلسوں میں اپنی جگہ بنا لی چونکہ ان شعری مجلسوں میں والبہ، ابو نواس اور نمیری جیسے لہو و لعب کے دلدادہ اور شراب و کباب کے عادی شاعروں سے اسکی صحبت رہی اس لیے اس کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی یہی رنگ اور جوانی کی رنگینی و مستی کا اثر پایا جاتا ہے مگر اس کے ابتدائی دور کے کلام کا بڑا حصہ مفقود ہو گیا اور کوفہ میں گزری اس کی زندگی کا حال بھی نہیں ملتا۔

بغداد میں آمد شاہی دربار میں ابو العتاہیہ کی رسائی اور بڑے بڑے شعراء کی ہم نشینی اس بات کا ثبوت ہے کہ کوفہ ہی میں اسکے کلام میں پختگی آ گئی تھی اور شاعری کے فن میں وہ کمال حاصل کر چکا تھا۔

بغداد کی تعمیر کے بعد شاعروں ادیبوں اور ارباب فن نے اسکی طرف رخ کیا اس لیے کہ اب کوفہ میں ان کی پذیرائی کا سامان نہیں رہ گیا تھا، یہ دیکھ کر ابو العتاہیہ بھی اپنے بچپن کے دوست ابراہیم الموصلی مغنی کے ہمراہ بغداد آیا لیکن بدقسمتی سے اس کی رسائی دربار تک نہ ہو سکی اس لیے مجبوراً کوفہ واپس آ گیا، مگر اسکے دوست ابراہیم کی قسمت نے یاوری کی

اور وہ دربار میں باریاب ہوگیا اور جب اس کا اثر و رسوخ بڑھا تو ایک روز اس نے موقع پاکر خلیفہ سے ابوالعتاہیہ کی سفارش کی اور اس کو دوبارہ کوفہ سے بغداد بلوایا، ابوالعتاہیہ نے خلیفہ کی مدح میں ایک شاندار اور پُرزور قصیدہ لکھا جس کو ابراہیم مغنی نے جب خلیفہ اور اہل دربار کے سامنے گایا تو تحسین و مرحبا کی آوازوں سے دربار گونج اٹھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اتتہ الخلافۃ منقادۃ — الیہ تجرر اذیالہا
ولم تک تصلح الا لہ — ولم یک یصلح الا لہا
ولو رامہا احد غیرہ — لزلزلت الارض زلزالہا[1]

(یعنی خلافت خلیفہ کے پاس مطیع اور فرمانبردار بن کر آئی ہے، نہ تو خلافت ہی کسی کے لیے زیب دیتی تھی اور نہ خلیفہ خلافت کے علاوہ کسی اور کام کے لیے موزوں تھا، خلیفہ کے علاوہ اگر کوئی دوسرا آدمی اس کا ارادہ بھی کرتا تو زمین کے اندر زلزلہ آجاتا یعنی زمین اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی)

یہ ایسا انوکھا تخیل تھا کہ تمام لوگ یہ اشعار سن کر حیران اور دم بخود رہ گئے۔ خلیفہ مہدی بھی بہت خوش ہوا اور خوب انعام و اکرام سے نوازا۔

اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر ابوالعتاہیہ نے بہت جلد خلیفہ ہی کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنائی بلکہ تمام بڑے بڑے وزراء و امرا، عمائد و ارکان سلطنت بھی اسکے فریفتہ اور گرویدہ ہوگئے، خلیفہ کے ماموں یزید بن منصور الحمیری سے اسکا اتنا گہرا تعلق ہوگیا تھا کہ اس نے اپنی نسبت عنزی چھوڑ کر ان سے اپنے کو منسوب کرنے لگا اور زندگی بھر ان کی مدح کرتا رہا۔

گو کوفہ ہی میں ابوالعتاہیہ کی شاعری چمک اٹھی تھی لیکن بغداد جیسے سازگار ماحول

[1] ابوالعتاہیہ، احمد برانق، ص ۱۰۴۔

وہاں نصیب نہیں ہوسکا تھا، اس لیے اس کی شاعری کا اصل دور یہیں سے شروع ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ابوالعتاہیہ نے وہ درجہ حاصل کر لیا کہ خلیفہ کا ہم نشین اور ہر وقت کا ساتھی ہوگیا، خوشی ہو یا غم، سفر ہو یا حضر، رات کی قصہ گوئی ہو یا تفریحی محفل ابوالعتاہیہ ہر موقع پر ساتھ رہتا۔ ایک مرتبہ خلیفہ مہدی کی بیٹی کا انتقال ہوگیا جس کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ کھانا پینا بھی ترک ہوگیا، جب ابوالعتاہیہ کو اس کی خبر ہوئی تو یہ تعزیتی اشعار لکھ کر پیش کیا:

ما للجدیدین لا یبلی اختلافہما — وکل غض جدید فیہما بال
یا من سلا عن حبیب بعد میتتہ — کم بعد موتک ایضا عنک من سال[1]

(دن رات کے آنے جانے سے گھبرانا نہیں چاہیے ہر دن ایک نئی آزمائش ہوتی ہے اور اے وہ شخص جس نے آج ایک حبیب کے مرنے پر تسلی دی ہے، تیری موت کے بعد کون کس کو تسلی دے گا)

جب خلیفہ نے یہ تعزیتی اشعار سنے تو کہا "بہت اچھا کہا تو نے تو ہمارے دل کی بات کہہ دی"۔ پھر انعام و اکرام سے نوازا اور ہر شعر پر ایک ہزار درہم عطا کیے۔

خلیفہ ہادی سے وابستگی ابوالعتاہیہ کا تعلق خلیفہ مہدی کے زمانے ہی سے ہارون الرشید سے ہوگیا تھا، اس لیے مہدی کے انتقال کے بعد جب ہادی تخت خلافت پر رونق افروز ہوا تو ابوالعتاہیہ کو خطرہ محسوس ہوا، کیونکہ ہادی کو معلوم تھا کہ اس کا رجحان ہارون کی طرف ہے، ابوالعتاہیہ نے اس کے تدارک کے لیے خلیفہ ہادی کی شان میں ایک شاندار مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ قصیدے میں اس نے اپنے خوف و ہراس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔

[1] اغانی از ابوالفرج الاصبہانی ج ۴/ ص ۴۰۔

الا شافع عند الخلیفۃ یشفع فیدفع عنا شر ما نتوقع

یروعنی موسی علی غیر عثرۃ الا انما موسیٰ من العفو اوسع[1]

(کیا خلیفہ سے معافی مانگنے والا بخش دیا جاتا ہے اور کیا خلیفہ ہم سے متوقع مصیبت کو دور کرے گا، بغیر کسی غلطی کے خلیفہ ہادی مجھے خوفزدہ کیے ہوئے ہے البتہ خلیفہ معاف کرنے میں بہت کشادہ دل ہے)

یہ ایک لمبا قصیدہ ہے جسے سن کر خلیفہ خوش ہوا اور باریابی کا موقع بخشا، جب خلیفہ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس کی خوشی میں خلیفہ کو یہ تہنیتی اشعار لکھ کر پیش کیے؛

اکثر موسیٰ غَیظَ حُسّادِہِ وَزَیَّنَ الارض بأَولادِہِ

وجاءنا من صلبہ سید اصید فی تقطیع اجدادہ[2]

(خلیفہ نے اپنے حاسدوں کے غصہ کو اور زیادہ کر دیا اور زمین کو اپنی اولاد سے زونق بخشی، ہمارے پاس خلیفہ کی صلب سے ایک اور سردار آیا ہے جس نے اپنے آباو اجداد کے قد کو اور سربلند کر دیا ہے۔)

خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں | خلیفہ ہادی ایک سال چند ماہ بعد انتقال کر گیا۔

اس کے بعد ایک طویل عرصہ ابو العتاہیہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ گزارا، یہی اس کا سنہرا دور کہلاتا ہے جس میں اس کی عظمت دوچند ہوئی اور اسی دور میں وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے زہد کی طرف مائل ہوا اور اسی میں اس کی شاعری کا وہ خاص رنگ ابھرا جس کو زہدیہ شاعری کہتے ہیں، اس زمانے میں اسے ابتلا سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

ابو العتاہیہ نے زہد کے اثر سے نہ صرف دربار سے کنارہ کشی اختیار کی بلکہ غزلگوئی

---

[1] اغانی: ج/۴/۵۶ [2] ابو العتاہیہ: احمد بلانق، ص ۱۱۶

بھی ترک کر دی اس کی وجہ سے ہارون الرشید نے اس کو اور اس کے دوست ابراہیم الموصلی مغنی کو قید میں ڈال دیا اور دونوں کے درمیان ایک وسیع دیوار حائل کر دی تاکہ وہ ایک دوسرے سے مل نہ سکیں اور یہ حکم بھی صادر کیا کہ جب تک ابو العتاہیہ غزل کہنے اور ابراہیم اس کو گانے کا عہد نہ کرے دونوں کو رہا نہ کیا جائے، اس تکلیف و مشقت کا اظہار ابو العتاہیہ نے یوں کیا ہے:

ایا غمی لغمک یا خلیلی ویا ویلی علیک! ویا عویلی

یعز علی انک لا ترانی وانی لا اراک ولا رسولی[1]

(اے دوست تیرے غم کی وجہ سے میرا غم اور بھی زیادہ ہو گیا ہے اور تیری مصیبت کی وجہ سے میرا واویلا اور زیادہ ہو گیا اور مزید برآں مشقت کا باعث یہ ہے کہ نہ تو مجھے دیکھ سکتا ہے اور نہ میں تجھے اور نہ میرا کوئی پیغام پہونچ سکتا ہے)

خلیفہ نے ایک مرتبہ ابو العتاہیہ کے ساتھ قید میں اس کی نگرانی کے لیے ایک آدمی کو مامور کر دیا تھا تاکہ جو اشعار بھی یہ کہے نگراں اس کو لکھ کر خلیفہ کے پاس بھیج دے۔ اسی زمانے میں ابو العتاہیہ نے جب یہ شعر کہے،

اما، واللہ ان الظلم لؤم وما زال المسئ ھو الظلوم

الی الدیان یوم الدین نمضی وعند اللہ تجتمع الخصوم[2]

(اللہ کی قسم ظلم کرنا گھٹیا پن ہے یعنی بادشاہ کے شایان شان نہیں ہے اور خطا کار ہمیشہ ظالم ہی ہوتا ہے، روز قیامت اللہ کے سامنے پیشی ہو گی اور اسی کے سامنے ظالم و مظلوم پیش ہوں گے)

اور خلیفہ نے انہیں سنا تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کو رہا کر کے ایک ہزار

---

[1] دائرۃ المعارف: ص ۴۴۴ [2] اغانی: ج/۴/۳۳-

دینار عطا فرمائے۔

خلیفہ سے تعلق و قربت کے باوجود ابوالعتاہیہ کی اپنی ایک منفرد رائے ہوتی تھی اور وہ معاشرہ کی موجودہ حالت اور روزمرہ کے واقعات کا تذکرہ بھی اشعار کے اندر کر دیتا تھا اس کی وجہ سے اسے متعدد بار قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑی۔

خلیفہ ہارون الرشید طبعاً حساس اور شکی واقع ہوا تھا، اس بنا پر ابوالعتاہیہ اکثر خوف و رجا اور امید و بیم میں رہتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ شاعر کو اور شاعر خلیفہ کو بہت زیادہ محبوب تھے، یہی وجہ ہے کہ شاعر خلیفہ کی مدح سرائی میں حد سے تجاوز بھی کر جاتا تھا۔ خلیفہ سے اس کو جس قدر تعلق تھا اس کی بنا پر اسکے اس سلسلے کے اشعار شاہکار رہے ہوں گے لیکن افسوس کہ اس دور کا کلام محفوظ نہیں رہا ورنہ ممکن تھا کہ وہ زہدیہ شاعری کی طرح غزلیہ شاعری کا بھی امام ہوتا اور ابونواس وغیرہ کو پیچھے چھوڑ جاتا۔

ابوالعتاہیہ مہدی سے لے کر مامون تک کے طویل زمانے میں جو تقریباً نصف صدی پر مشتمل ہے چھایا ہوا نظر آتا ہے، لیکن پورا شعری سرمایہ زمانہ کی دست برد کی نذر ہو گیا صرف چند چیزیں ہی ملتی ہیں جو خلیفہ کی مدح سرائی میں ہیں۔

خلیفہ مامون سے ابوالعتاہیہ کی وابستگی خلیفہ ہارون کے انتقال کے بعد امین خلیفہ ہوا مگر اس کے قتل کے بعد زمام سلطنت مامون کے ہاتھوں میں آگئی۔

امین کے قتل کے وقت اس کی ماں سیدہ زبیدہ اس کے پاس بغداد ہی میں تھی اسے فکر لاحق ہوئی کہ معلوم نہیں مامون اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرے، اس لیے اس نے ابوالعتاہیہ سے اشعار لکھنے کی فرمائش کی تاکہ وہ مامون کے غیظ و غضب سے محفوظ رہے۔ ابوالعتاہیہ نے اس کی فرمائش پر ایک بہترین قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

الا ان صرف الدهر يدنی و يبعد ۔۔۔ ويمتع بالالاف طورا ويفقد

اقول لريب الدهر ان ذهبت يد ۔۔۔ فقد لقيت والحمد لله احمد

اذا لقبى المامون لى فالرشيد لى ۔۔۔ ولى جعفر لم يفتقد ومحمد

(بے شک زمانہ کی گردش کبھی قریب ہو جاتی ہے اور کبھی دور اور کبھی گردش ایام ہزاروں میں کھیلنے کا موقع دیتی ہے اور کبھی تنگ دست بنا دیتی ہے، میں گردش زمانہ سے کہوں گا کہ میرا اگر ایک مددگار چل بسا ہے تو الحمد للہ احمد تو باقی ہے اور جب مامون باقی ہے تو وہ میرے لیے رشید کی طرح ہے اور جعفر و محمد بھی ابھی باقی ہیں)

خلیفہ مامون ان اشعار کی وجہ سے زبیدہ سے خوش ہو گیا اور اس کے پاس ہدایا بھیجے اس کے علاوہ انہیں اپنے پاس آنے کی دعوت بھی دی، جب زبیدہ مامون کے پاس گئیں تو یہ کہا:

الحمد لله لئن فقدت ابنا	اگر چہ میں ایسے بیٹے کو جو کہ خلیفہ تھا
خليفة فلقد اعتضت	کھو چکی ہوں لیکن الحمد للہ دوسرا خلیفہ
ابنا خليفة۔	بیٹا میں نے حاصل کر لیا ہے۔

مامون نے کہا:

ما تلد النساء مثل هذه نما	کسی عورت نے تجھ جیسی کو جنم نہیں دیا
ذا البقيت فی هذا الكلام	تو نے ماہرین زبان کے لیے اس میں کوئی
لبلغاء الرجال	گنجائش نہیں چھوڑی۔

مامون نے شعر کہنے والے کا نام دریافت کیا، زبیدہ نے جواب دیا کہ "ابوالعتاہیہ"

۱؎ کتاب بغداد: ابن طیفور۔ ص ۱۹۔

مامون نے پوچھا کہ اس کو کتنا انعام دیا؟ زبیدہ نے کہا کہ "بیس ہزار درہم" مامون نے بھی بیس ہزار دینے کا حکم فرمایا۔[1]

اس واقعہ کے بعد ابوالعتاہیہ کا دربار سے مستقل تعلق ہوگیا اور کبھی کبھی خلیفہ اس کے ان اشعار کو سنتا جو اس نے موت اور دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں کہے ہیں، مثلاً:

انساک محیاک المماتا	فطلبت فی الدنیا الثباتا
اوثقت فی الدنیا وانت	تری جماعتہا شتاتا[2]

(تجھ کو تیری زندگی نے موت سے غافل کر دیا پس تو دنیا میں ثبات کا طلب گار بن بیٹھا یا تو دنیا پر بھروسہ کر بیٹھا حالانکہ تو جانتا ہے کہ دنیا کا شیرازہ منتشر ہوتا رہتا ہے۔)

خلیفہ مامون علم دوست اور علم نواز نہ تھا بلکہ علم و ادب کا اچھا ذوق بھی رکھتا تھا خاص طور پر فن شاعری سے اس کو زیادہ دلچسپی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ بڑے بڑے شعراء پر بلا جھجک تنقید کر دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ ابوالعتاہیہ نے خلیفہ کی موجودگی میں کچھ اشعار سنائے تو ابوالعتاہیہ بھی تنقید سے نہ بچ سکا، جب ابوالعتاہیہ نے کہا:

ما احسن الدنیا واقبالہا	اذا اطاع اللہ من نالہا
من لم یواس الناس من فضلہا	عرض للادبار اقبالہا[3]

(دنیا اسی وقت اچھی ہے جب اس کو پانے والا اللہ کا فرمانبردار ہو اور جو دنیا پانے کے بعد غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری نہ کرے اس سے دنیا پیٹھ پھیر لیتی ہے)

جب خلیفہ مامون نے یہ اشعار سنے تو کہا کہ "پہلا شعر عمدہ ہے لیکن دوسرے

---

[1] ابوالعتاہیہ احمد ہزانی۔ ص ۱۵۵ [2] اغانی: ج/۴/۵۴ [3] ابوالعتاہیہ: احمد ہزانی۔ ص ۱۵۷۔

شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ دنیا سب ہی سے پیٹھ پھیر لیتی ہے خواہ وہ غریبوں کی مدد کرے یا بخل سے کام لے، البتہ لوگوں کی غمخواری سے اس کو ثواب ملے گا اور بخل سے گناہ"، ابوالعتاہیہ نے کہا "صدقت یا امیر المومنین اھل الفضل اولی بالفضل واھل النقص اولی بالنقص"، یہ سن کر خلیفہ نے اعتراف حق کے صلہ میں اس کو دس ہزار درہم دینے کا حکم فرمایا، غرض مامون کے عہد میں بھی اس کی پذیرائی اور قدردانی کا سلسلہ جاری رہا مگر اسی دور میں اس کو اچانک موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ والبقاء للہ وحدہ۔

ابوالعتاہیہ کے اخلاق و عادات

ابوالعتاہیہ کے والد عسیر الحال تھے، عسرت ہی کی وجہ سے وہ آبائی وطن چھوڑ کر کوفہ میں متوطن ہوئے، ابوالعتاہیہ سن رشد کو پہنچا تو اس کو اس بات کا احساس رہ رہ کر ستاتا تھا کہ ہم دینی اور دنیوی وجاہت سے محروم ہیں، نسبی حیثیت سے وہ موالی میں تھا اور پیشے کے اعتبار سے بھی حجام اور خزاف، یہ احساس اس کو زندگی بھر دامن گیر رہا، ممکن ہے زہد کی طرف اس کے میلان کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو، ایک زمانے میں اس کا زیادہ وقت لہو و لعب میں گزرتا تھا اور اس کی بعض دوسری عادتوں کی وجہ سے تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ وہ اچھے اخلاق و سیرت کا حامل نہ تھا۔ علاوہ ازیں اس کے ابتدائی دور کے کلام میں فحش، یاوہ گوئی اور بے راہ روی کا رنگ غالب تھا، جس کا سلسلہ ہارون الرشید کے زمانے تک باقی رہا۔ اس کے بعد وہ زہد کی طرف مائل ہوا اور آخر تک اسی رنگ میں اس کا کلام ڈوبا رہا۔

مگر حالات کے ساتھ ساتھ اس کے عادات و اطوار کے اندر بھی خوشگوار تبدیلی رونما ہوتی رہی، یعنی وہ ہمیشہ شاعرانہ ذوق و طبیعت کا مالک رہا اور شعراء جن اوصاف[1]

سے متصف ہوتے ہیں وہ بھی ان سے متصف رہا۔

ابوالعتاہیہ کا عقیدہ خلافت عباسیہ خصوصاً ہارون الرشید اور مامون کے زمانے میں مذہبی اور فکری آزادی کی وجہ سے بغداد مختلف افکار و مذاہب کا مرکز بن گیا تھا جس کا اثر لامحالہ لوگوں کے عقائد و افکار پر بھی پڑا اور نومسلم تو خاص طور پر ان رجحانات سے متاثر ہوئے، ابوالعتاہیہ پر بھی ان افکار کا اثر انداز ہونا اس لیے مستبعد نہیں ہے کہ اسکا نہ کسی ممتاز علمی و دینی خانوادہ سے تعلق تھا اور نہ دینی علوم کی تحصیل کی اسے مہلت ملی، تاہم وہ صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ اس کے بیٹے محمد بن ابوالعتاہیہ کا بیان ہے کہ جس وقت میرے والد نے عتبہ کے بارے میں یہ اشعار کہے:

كان عتابة من حسنها　　　دمية قس فتنت قسها .
يارب لو انستيها بما　　　في جنة الفردوس لم انسها[1]

(گویا کہ عتبہ اپنے حسن جمال میں کسی بت خانہ کی تصویر ہے جس پر پادری فریفتہ ہوگیا ہے اے خدا اگر میں یہاں اس کو بھول بھی جاؤں تو جنت الفردوس میں میں اس کو کیسے بھول سکونگا)

منصور بن عمار نے جب یہ اشعار سُنے تو ابوالعتاہیہ کے زندیق ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا اور کہا کہ یہ شخص جنت کی توہین کرتا ہے اور اپنے اشعار میں جنت و دوزخ کا تذکرہ نہیں کرتا صرف موت کا تذکرہ کرتا ہے، جب ابوالعتاہیہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے منصور کے پاس یہ اشعار لکھ کر بھیجے:

ان يوم الحساب يوم عسير　　　ليس للظالمين فيه نصير
فاتخذ عدة لمطلع القبر　　　وهول الصراط يا منصور .

[1] اغانی: ج ۴/ ۵۳۔

(قیامت کا دن بہت سخت ہے، جہاں ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، اے منصور قبر جو کہ پہلی منزل ہے اور پلصراط کی ہولناکی سے بچنے کی تیاری کر)

منصور بن عمار کو جب ان اشعار کا علم ہوا تو اپنے قول سے رجوع کر لیا اور کہا کہ:

اشهد كفران ابا العتاهية　　　میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ ابوالعتاہیہ
قد اعترف بالموت والبعث　　　نے موت اور ما بعد الموت کا اقرار کر لیا
ومن اعترف بذالك فقد　　　ہے اور جس نے اس کا اعتراف کر لیا تو وہ
بريئ مما قذف به"[1]　　　اس تہمت سے بری ہوگیا۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ابوالعتاہیہ سے کہا کہ لوگ تمہیں زندیق سمجھتے ہیں ابوالعتاہیہ نے کہا، حضور میں کیسے زندیق ہو سکتا ہوں جبکہ میرا قول ہے کہ:

ايا عجبا كيف يعصى الاله　　　ام كيف يجحد الجاحد
وفي كل شئي له اية　　　تدل على انه واحد[2]

(کتنے تعجب کی بات ہے کہ اللہ کی نافرمانی یا اس کا کوئی انکار کرے، جبکہ ہر جگہ ہر شے کے اندر اس کی نشانیاں بھری پڑی ہیں کہ وہ ذات واحد ہے)

اس قسم کے بہت سے اشعار کی وجہ سے وہ زندیقیت سے بری ہو جاتا ہے تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بعض اشعار میں مسلمہ عقائد کے خلاف باتیں بھی ملتی ہیں مگر ان کو دینی علوم سے اس کی ناواقفیت پر محمول کرنا چاہیے، تذکرہ نگاروں نے اس بارے میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں، بعض کے خیال میں وہ فلاسفہ کے مذہب کو مانتا تھا جو بعث و نشور پر یقین نہیں رکھتے اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے اشعار میں

[1] ابوالعتاہیہ۔ عبداللطیف شرارہ۔ ص ۴۵ ۔ [2] ایضاً

موت وفنا کا ذکر نہیں ملتا، بعض نے زندقہ اور الحاد کی نسبت اس کی طرف کی ہے، ابن المعتز نے ابوالعتاہیہ کو ان مانوی عقائد سے متاثر بتایا ہے جو اس وقت بغداد میں رائج تھے۔

بعض کا قول ہے کہ وہ شیعہ تھا، چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے کہ "اگر تمہیں کسی شریف اور پاکباز انسان کی تلاش ہے تو جس نے درویشوں کا لباس پہن رکھا ہے اس کی طرف رجوع کرو"۔

اذا اردت شریف الناس کلھم — فانظر الی ملک فی زی مسکین [1]

اس قسم کے اشعار سے ابوالعتاہیہ کا اشارہ امام موسیٰ کاظم اور دوسرے شیعی ائمہ کی طرف ہوتا تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خلق قرآن کا قائل تھا اور اس کا جھکاؤ معتزلہ کی طرف تھا [2]، غرض مورخین اور تذکرہ نگاروں کے ان متضاد اقوال کی وجہ سے کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔

ابوالعتاہیہ کا بخل تراجم و تذکرہ کی کتابوں میں ابوالعتاہیہ کے بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں بخل کی مذمت اور اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، مثلاً:

الحرص لؤم ومثلہ الطمع — ما اجتمع الحرص قط والورع [3]

(حرص وطمع بہت بری چیزیں ہیں، تقویٰ و پرہیزگاری اور طمع و حرص ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں)

ایک جگہ کہتا ہے:

اذا المرء لم یعتق من المال نفسہ — تملکہ المال الذی ھو مالکہ

الا انما مالی الذی انا منفق — ولیس لی المال الذی انا تارکہ [4]

(جب انسان اپنے نفس کو مال سے آزاد نہیں کرتا تو مال اس کا مالک بن جاتا ہے جب کہ وہ اس کا مالک تھا، بیشک میرا مال وہی ہے جس کو میں خرچ کر دیتا ہوں اور جس کو میں چھوڑ جاتا ہوں وہ میرا مال نہیں ہے)

[1] اغانی: ج ۳/۱۰ [2] ایضاً [3] ابوالعتاہیہ: سید احمد براقی، ص ۶۷ [4] اغانی ج ۴/۱۸-

ثمامہ نے پوچھا کہ یہ مضمون تونے کہاں سے حاصل کیا ہے، ابوالعتاہیہ نے جواب دیا کہ حضورؐ کے فرمان "انما لک من مالک ما اکلت فافنیت ولبست فابلیت او اعطیت فامضیت" سے ثمامہ نے کہا کہ کیا تم حضورؐ کے اس فرمان کو حق مانتے ہو، ابوالعتاہیہ نے کہا کیوں نہیں۔ ثمامہ نے کہا پھر بھی اپنے گھر اتنا مال جمع کرتے ہو کہ نہ اسے خود کھاتے ہو اور نہ اس کی زکوٰۃ دیتے ہو۔ ابوالعتاہیہ نے کہا ابو معن تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں فقر و فاقہ اور لوگوں کا محتاج اور دست نگر ہونے سے ڈرتا ہوں۔ ثمامہ نے کہا اس سے بڑھ کر فقیری کیا ہوگی کہ تو ہمیشہ محزون ہی رہتا ہے اور خود اپنی ذات پر خرچ کرنے میں بھی بخل سے کام لیتا ہے، میری اس بات کا جواب دینے کے بجائے وہ کہنے لگا کہ عاشورہ کو گوشت خریدا تھا اس کے پانچ درہم ابھی تک ادا نہیں ہو سکے، اسے سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی کہ اللہ نے اسلام کے لیے اس کا سینہ نہیں کھولا ہے [1]

معد بن عیسیٰ نے ابوالعتاہیہ سے پوچھا کہ کیا تم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے ہو؟ اس نے کہا جو کچھ میں اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہوں وہ میرے مال کی زکوٰۃ ہی تو ہے، معد نے کہا زکوٰۃ کا مال فقراء ومساکین کے لیے ہوتا ہے، ابوالعتاہیہ کا جواب یہ تھا کہ اگر میں اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بند کردوں تو ان سے بڑھ کر فقیر روئے زمین پر کوئی نہ رہے گا [2]

اسی طرح کے دوسرے واقعات بھی کتابوں میں مذکور ہیں جن کی بنا پر بعض لوگوں نے اس کے زہد کے بارے میں بھی شک وشبہ کیا ہے، لیکن اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں، جیسے افضل زہد وہ ہے جو مالداری کے ساتھ ہو چنانچہ اس کا شعر ہے:

افضل الزھد زھد کان عن جدۃ — وافضل العفو عفو عند مقدرۃ

[1] دائرۃ المعارف۔ فواد افرام البستانی ج ۴/۳۴۳ [2] اغانی ج ۴/۲۱-

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ادب کی کتابیں بخلا کے قصوں اور نوادرات سے بھری پڑی ہیں، اسی زمانے کے مشہور ادیب و انشاپرداز جاحظ نے کتاب البخلا لکھی لیکن اس نے یا کسی اور ادیب نے بھی ابو العتاہیہ کو بخلا کی فہرست میں شمار نہیں کیا۔

ابو العتاہیہ کا معاشقہ عشق و محبت بھی شاعر کی ایک پہچان بن گئی ہے اور بعض شعراء نے فرضی محبوبوں پر اپنی غزلیہ شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ ابو العتاہیہ بھی متعدد بار عشق و محبت کے دام میں گرفتار ہوا اور نامراد رہا جس کی بنا پر اسے عورتوں سے نفرت اور دنیا سے بیزاری ہوگئی۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ عشق و محبت کی ناکامی نے ابو العتاہیہ کی زندگی میں انقلاب پیدا کردیا اور اس نے زہد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، ابو العلاء معری کہتا ہے:

اللہ ینقل من شاء — رتبۃ بعد رتبۃ
ابدی [illegible] نسکا — وتاب عن حب عتبۃ

(اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے، ابو العتاہیہ نے زہد کا اظہار کیا اور عتبہ کی محبت سے تائب ہوگیا۔)

ابو العتاہیہ کی ادبی یادگاریں اور معاصرین کی رائیں ابو العتاہیہ کے شعری اکتسابات کا سرمایہ نہایت وافر تھا، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کے ۳۲ یا ۳۳ شعری مجموعوں کا تذکرہ کیا ہے[1] لیکن یہ سب بادِ حوادث کی زد سے محفوظ نہیں رہے۔ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ:

وھو احد من سار قولہ — ابو العتاہیہ ان شعراء میں سے تھا
وانتشر شعرہ وشاع ذکرہ — جس کا کلام اور تذکرہ ہر خاص و عام

[1] الفہرست، ابن ندیم: ص ۲۳۳۔

ویقال ان احداً لم یجتمع لہ — کی زبان پہ تھا اور یہ بات بھی کہی جاتی ہے
دیوانہ لعظمہ[1] — کہ اس کا کلام اتنا زیادہ تھا کہ کوئی اسے
جمع نہیں کر سکا۔

ابو الفرج اصبہانی نے بھی کتاب الاغانی میں متعدد اقوال نقل کرکے اس کے شعری سرمایے کی کثرت و اہمیت دکھائی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ مشہور ہے۔

اطبع الناس بشار بن برد — شعراء میں سب سے زیادہ ماہر اور جودتِ
والسید الحمیری وابو العتاھیۃ — طبع والے بشار، سید الحمیری اور ابو العتاہیہ
وما قدر احد علی جمع شعر — ہیں اور ان کے اشعار کی کثرت کی بنا پر
ھؤلاء لکثرتہ[2] — کوئی ان کو جمع نہیں کر سکا۔

حرمازی نے ایک مرتبہ ابو العتاہیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: "لو شئت ان اجعل کلامی شعراً لفعلت"[3] کہ اگر میں چاہتا تو اپنا پورا کلام شعر ہی بنا دیتا۔ رجاء بن مسلم نے سلم الخاسر سے کہا، من اشعر الناس؟ (سب سے بڑا شاعر کون ہے؟) اس نے کہا جس کے یہ اشعار ہیں:

کل نفس عند میتتھا — حظھا من مالھا الکفن
ان مال المرء لیس لہ — منہ الا ذکرہ الحسن[4]

(آدمی کا حصہ اس کے مال میں سے مرتے وقت صرف اتنا ہی ہے جس سے اس کا کفن تیار ہو سکے اور انسان کے مال سے صرف اس کا ذکرِ خیر ہی باقی رہ جاتا ہے۔)

بشار بن برد نے بھی اس کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شاعر کہا اور ابو نواس سے

[1] تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۶/ ۱۵۰ [2] اغانی ج ۴/ ۱۳ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

جب کوئی سوال کرتا کہ تم بڑے شاعر ہو یا ابوالعتاہیہ؟ تو وہ یہی جواب دیتا:

واللہ ماراٗیتہ قط الا   یعنی جب کبھی میں نے اس بارے میں

ظننت انہ سماوی وانا ارضی   سوچا تو مجھے یہی لگا کہ وہ شعروادب کے آسمان پر ہے اور میں زمین پر۔

ابوتمام نے ابوالعتاہیہ کے مندرجہ ذیل پانچ شعروں کو بے نظیر اور لاجواب قرار دیا ہے:

الناس فی غفلاتهم   ورحی المنیة تطحن

لوگ غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہیں، حالانکہ موت کی چکی ان کو پیستی جارہی ہے۔

الم تر ان الفقیر یرجی لہ الغنی   وان الغنی یخشی علیہ الفقر

کیا تو نے کبھی غور کیا کہ جب آدمی فقیر ہوتا ہے تو وہ غنی کا طلب گار ہوتا ہے اور جب مالدار ہوتا ہے تو فقروفاقہ سے ڈرتا ہے۔

ولما استقلوا باثقالهم   وقد ازمعوا للذی ازمعوا

جب انسان کی ذمہ داریاں کم ہوتی ہیں تو وہ جس کام کا بھی ارادہ کرلیتا ہے اس کو کرگزرتا ہے۔

قرنت التفاتی باثارهم   واتبعتهم مقلة تدمع

جب میں نے ان کے آثار قدیمہ کی طرف توجہ کی اور ایک نظر ادھر دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

هب الدنیا تصیر الیک عفوا   الیس مصیر ذالک الی زوال[1]

[1] ابوالعتاہیہ: عبداللطیف شرارہ، ص ۵۴۔

۵-(جتنا ہوسکے صدقہ خیرات کر، یہ دنیا خود بخود تیرے پاس چلی آئے گی اور کیا اس کا انجام زوال نہیں ہے۔)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالعتاہیہ اپنے دور کا ہی نہیں مابعد کا بھی ایک بہت اچھا اور کامیاب شاعر تھا جس کی عظمت کا لوہا اس کے ہم عصر اور بعد کے شعرا بھی مانتے تھے، اسے جو مقبولیت اور خلفا و وزرا کے درباروں سے جو انعام و اکرام حاصل ہوا وہ اسکے ہم عصروں کو نصیب نہیں ہوسکا۔

ابوالعتاہیہ کی وفات خلیفہ مامون کے عہد میں ۲۱۳ھ میں وہ پیٹ کے مرض میں مبتلا ہوا اور جاں بر نہ ہوسکا، جب اسے وقت آخر کا احساس ہوگیا تو اس نے اپنے دوست مخارق سے یہ اشعار گانے کی فرمائش کی۔

اذا ما انقضت عنی من الدهر مدتی   فان عزاء الباکیات قلیل

سیعرض عن ذکری وتنسی مودتی   ویحدث بعدی للخلیل خلیل[1]

جب کہ میں نے ایک زمانہ یہاں پر گزارا ہے پھر بھی رونے والیوں کی تعداد اتنی کم ہے، میرے دوست بھی میرے تذکرے سے اعراض کریں گے اور تو بھی میری محبت کو بھلادے گی اور ہر دوست کو میرے بعد اور دوست مل جائیں گے۔

صاحب اغانی نے محمد بن ابوالعتاہیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سب سے آخری اشعار جو میرے والد نے مرض الموت میں کہے وہ یہ ہیں:

الٰهی لا تعذبنی فانی   مقر بالذی قد کان منی

ومالی حیلة الا رجائی   وعفوک ان عفوت وحسن ظنی

[1] ابوالعتاہیہ: عبداللطیف شرارہ، ص ۵۴۔

یظن الناس بی خیراً وانی — لشر الناس ان لم تعف عنی[1]

"خداوندا! مجھے عذاب مت دینا، اس لیے کہ مجھے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف واقرار ہے اور میرے لیے بجز امید و حسن ظن اور تیری معافی کے بشرطیکہ تو معاف کر دے کوئی حیلہ و تدبیر نہیں ہے، لوگ میرے بارے میں اچھا خیال کرتے ہیں حالانکہ میں سب سے برا انسان ہوں اگر تو نے معاف نہیں کیا۔"

سن وفات میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے ۲۱۳ھ، بعض نے ۲۱۱ھ اور ایک قول ۲۰۹ھ کا بھی ہے، لیکن اس میں اتفاق ہے کہ عہد مامونی میں انتقال ہوا اور بغداد کے غربی جانب حیال قنطرۃ الزباتین نامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (باقی)

---

[1] اغانی: ج/۴/۱۱۳۔

مولانا شبلی کی بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن

سیرۃ النبی: حصہ اول؍ دوم۔ یہ دونوں کتابیں کمپیوٹر سے کمپوز کر کے حال ہی میں شایع ہوئی ہیں۔ ان میں غلطیوں کی تصحیح اور مکمل حوالوں کی تخریج کے علاوہ اشاریے اور ببلوگرافی کا اضافہ بھی شامل ہے۔ قیمت حصہ اول مجلد ۱۹۰ روپے۔ حصہ دوم مجلد ۱۹۰ روپے

الغزالی: یہ کتاب بھی مدت دراز سے ختم تھی، اب کمپیوٹر سے کمپوز ہو کر اسکا صاف ستھرا اور پاکیزہ ایڈیشن نکلا ہے۔ قیمت مجلد ۱۲۰ روپے

الفاروق: چند برس پہلے مولانا کی اس مہتم بالشان کتاب کا عکسی ایڈیشن شایع ہوا ہے۔ قیمت ۹۵ روپے

المامون: ہی کے زمانے کا ابو العتاہیہ مشہور شاعر ہے۔ مامون اور اسکے عہد کے حالات اور ادبی و علمی مجلسوں کی روداد مولانا کے سحر نگار قلم سے مطالعہ کے لائق ہے۔ قیمت ۵۰ روپے۔

"منیجر"

مکتوبات صدی کے نسخہ عہد مصنف کا عکسی ایڈیشن

از جناب شمیم منعمی صاحب

مکتوبات صدی کسی تعارف کی محتاج نہیں، شاید ہی مکتوبات کے کسی مجموعہ کو وہ شہرت اور مقبولیت ملی ہو، جو کہ مکتوبات صدی کو نصیب ہوئی۔ یہ مکتوبات زبان و بیان، مضامین و مطالب اور موضوع و مقصد کے اعتبار سے شاہکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی اور چھوٹی لائبریری میں بشرطیکہ اس کا تعلق مخطوطات سے ہو، اس کے کئی کئی خطی نسخے مل جاتے ہیں۔ خود اس مجموعۂ مکتوبات کے مکتوب نگار حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ) کے عہد میں اس کے متعدد نسخے تیار ہو چکے تھے۔ چنانچہ مکتوبات صدی کے مشہور و معروف نسخے کے مرتب حضرت زین بدر جو کہ مکتوب نگار کے مرید خاص بھی ہیں، اسی مکتوبات صدی کے مقدمے میں اس زمانے (۷۴۷ھ) کے بارے میں لکھتے ہیں، جب کہ مکتوبات قلم مخدوم سے برآمد ہو رہے تھے:

"ایں مجموعہ خدمت گاران و خادمان کہ دراں محل حاضر بودند ازاں مکتوبات انتساخ کردند و بدیں ترتیب مرتب گردانیدند تا باشد کہ روزے وقتے توفیق رفیق شان گردد و بعمل مقرون گردانند"۔

انہیں میں سے ایک نسخے کا دعویٰ کرتے ہوئے خدابخش لائبریری پٹنہ نے اسکا عکسی ایڈیشن (FACSIMILE EDITION) شایع کیا ہے۔ اس ایڈیشن میں

تعارف کے عنوان سے مشہور مورخ پروفیسر سید حسن عسکری صاحب مرحوم کے اسی نسخے سے متعلق دو مقالے بزبان انگریزی شامل کیے گئے ہیں اور تقدم / پیش لفظ کے عنوان سے علوم شرقیہ کے مشہور عالم مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل صاحب مدظلہ کی ۱۲ صفحات پر مشتمل تحریر ہے، جس سے نسخے کے مطالعہ میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ "حرفے چند" کی سرخی سے اس وقت کے لائبریری کے ڈائریکٹر عابد رضا بیدار صاحب کی تین صفحات پر مشتمل نگارش ہے۔

مگر افسوس ہے کہ مکتوبات صدی کا زیر تبصرہ عکسی ایڈیشن غیر ذمہ داری اور بے پروائی سے مرتب ہوا ہے، جس کا اندازہ ہماری درج ذیل معروضات سے ہوگا۔

① بیدار صاحب حرفے چند کے تحت فرماتے ہیں:

" مکتوبات صدی، فوائد رکنی، خوان پر نعمت، ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، معدن المعانی، مخ المعانی، عقائد شرفی، شرح آداب المریدین، راحت القلوب، سہ صدی مکتوبات، مکتوبات جوابی حضرت شیخ یحییٰ منیری کے اصل فارسی متن چھپ چکے ہیں" (ص۵)

یہ غیر ذمہ دارانہ اطلاع ہے کیونکہ "فوائد رکنی" اور "شرح آداب المریدین" کا مکمل فارسی متن ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ شرح آداب المریدین کے صرف ایک حصے کا اصل فارسی متن مع حاشیہ ملا غلام یحییٰ بہاری شایع ہوا تھا۔

② " مکتوبات صدی، ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، فوائد رکنی، خوان پر نعمت شرح آداب المریدین، معدن المعانی مونس المریدین، اوراد شرفی، عقیدۂ شرفی، سبیل رشاد (دو جلدوں میں ۱۰۱ مکتوبات کا ترجمہ از مکتوبات دو صدی) اردو ترجمہ

میں آچکی ہیں" (ص۵)

(الف) شرح آداب المریدین کا اردو ترجمہ آنا تو دور اس کا مکمل اردو ترجمہ آج تک ہوا بھی نہیں ہے چہ جائیکہ شایع ہونا۔ اس کی صرف ایک جلد کا اردو ترجمہ منظر عام پر آیا ہے جو کہ ۱۶ فصول کی شرح پر محیط ہے جبکہ آداب المریدین اور اس کی شرح ۴۲ فصول پر محیط ہے۔

(ب) "اوراد شرفی" حضرت مخدوم جہاں کی جانب اوراد کے تین مجموعے منسوب ہیں۔ (۱) اوراد کلاں (۲) اوراد اوسط (۳) اوراد خورد۔ ان کے علاوہ مکتوبات وملفوظات میں بھی خال خال اوراد وظائف مذکور ہیں۔ اوراد شرفی کے نام سے بہت بعد میں کسی بزرگ نے مخدوم کے مذکورہ بالا اوراد وظائف کی تلخیص وتخریج وترتیب فرمائی ہے اس لیے مخدوم کے مکتوبات وملفوظات کے ساتھ اوراد شرفی کا ذکر میرے خیال میں درست نہیں ہے۔

(ج) مکتوبات دو صدی کا مکمل یکجا اردو ترجمہ خانقاہ معظم بہار شریف کے مکتبہ شرف سے شایع ہو چکا ہے، اس سے بے خبری افسوسناک ہے، اس میں ۲۰۸ مکتوبات کا اردو ترجمہ موجود ہے۔

(د) "فوائد المریدین" کے اردو ترجمہ کی اشاعت سے اب تک خدا بخش لائبریری کا انفارمیشن سیکشن بے خبر ہے۔

③ " مندرجہ ذیل تصانیف ابھی شایع نہیں ہوئی ہیں۔

مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست و ہشت، اجوبہ واسئلہ، رسالہ مکیہ اشارات شرفی، رسالہ ذکر مخدوم الملک، رسالہ مرآۃ المحققین، رسالہ وجودیہ، رسالہ وصول الی اللہ، گنج لایفنی، ملفوظ الصفر، ملفوظات شرف الدین یحییٰ منیری،

انیس العشاق، اسباب النجاۃ، رسالہ در ہدایت حال تحفہ غیبی، لطائف معانی، ملفوظات زادراہ۔" (ص۵)

(الف) پتہ نہیں اس سے ان کتابوں کے متن کے شایع نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یا ترجمہ کے؟

(ب) اگر متن مراد ہے تو اطلاعاً عرض ہے کہ مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست و ہشت اور رسالہ اجوبہ کاکوی کے اصل فارسی متن بہت پہلے شایع ہو چکے ہیں، قیاس غالب ہے کہ انکے مطبوعہ نسخے خدا بخش لائبریری میں بھی موجود ہوں گے۔

(ج) اگر اردو ترجمہ کے شایع نہیں ہونے کی اطلاع دی جارہی ہے تو ذہن صاف ہو جانا چاہئے کہ "مکتوبات دو صدی" اور "مکتوبات بست و ہشت" کا مکمل اردو ترجمہ خانقاہ معظم بہار شریف کے مکتبہ شرف سے کئی سال پہلے چھپ چکا ہے۔

(د) اجوبہ کے نام سے مخدوم کے دو الگ الگ رسالے ملتے ہیں (۱) اجوبہ کلاں (۲) اجوبہ خورد۔ یا (۱) اجوبہ زاہدیہ (۲) اجوبہ کاکویہ۔

(ھ) "اشارات" کے ساتھ "شرفی" کی نسبت کسی نسخے میں نظر سے نہیں گزری۔

(و) اسباب النجاۃ کا پورا نام "اسباب النجاۃ لفرقۃ العصاۃ" ہے۔

(ز) لطائف معانی دراصل معدن المعانی کی ہی تلخیص ہے۔

(ح) ملفوظ الصفر، گنج لایفنی، ملفوظات شرف الدین یحیٰی منیری (؟) اور تحفہ غیبی ملفوظات کے مجموعے ہیں، انہیں تصانیف کے زمرے میں لکھنا درست نہیں۔

(ط) پیش کردہ فہرست بھی نامکمل ہے۔

④ " مخدوم صاحب ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے [1]

[1] مخدوم صاحب کے متعلق فادر جیکسن کے خیال میں صحیح تاریخ ۶۹۰ھ کے آس پاس ہے۔ ص۵

فادر جیکسن نے یہ خیال کہاں ظاہر کیا، اس کی وضاحت ضروری تھی، بغیر وضاحت کے اس اطلاع کا نقل کرنا صحت مند اختلاف نہیں ہے۔

⑤ " مکتوبات صدی کئی بار چھپ چکا ہے اصلاً بھی، ترجمتاً بھی لیکن خدا بخش لائبریری اور خاص کر اس صدی کو یہ شرف حاصل ہونا تھا کہ مکتوبات صدی کا سب سے قیمتی نسخہ اس کے مکمل عکسی اڈیشن کی شکل میں آپ تک پہنچانے کا شرف حاصل کرے۔" (ص۶)

(الف) یہ علمی دنیا کی بدقسمتی ہے کہ متن اور ترجمے کی اشاعت کا سلسلہ تو جاری ہے لیکن آج تک مکتوبات صدی کا باضابطہ اڈیٹ نسخہ منظر عام پر نہ آسکا، خدا بخش لائبریری اپنے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی بنا پر اس اہم فریضے کو بخوبی ادا کر سکتی ہے لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ نامکمل متن اور ناقابل قرأت حاشیے کی ہوبہو اشاعت پر خود کو مشرف سمجھا جارہا ہے۔

(ب) نسخہ موصوفہ و مذکورہ ناقص الطرفین ہے، صرف حاشیے کی بنا پر عام نسخوں سے ممتاز ہے لیکن یہ حاشیے بھی اکثر ناقابل قرأت ہیں الا ماشاء اللہ۔

⑥ " متن کے حواشی کی وجہ سے مکتوبات صدی کا یہ نسخہ خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ حواشی ایک خیال کے مطابق حضرت مظفر شمس بلخی اور ایک خیال کے مطابق جس کے شواہد قوی تر ہیں، حسین معز بلخی (حسین نوشہ توحید) کے قلم سے ہیں۔" (ص۶)

(الف) حواشی کی خصوصی اہمیت مسلم لیکن اسے پیش کرنے والے کتنی اہمیت دے رہے ہیں یہ ان کے پیش کرنے کے انداز سے نمایاں ہو جاتا ہے فرماتے ہیں:۔

" حواشی کی ایک صاف نقل آج کی کتابت میں دی جارہی ہے، اگر کوئی حاشیہ جدید خط میں نہ ملے تو آپ خود ان نقول کی روشنی میں پڑھنے کی زحمت گوارا فرمالیں کہ نقل کرنے میں بہت سے حواشی چھوٹ بھی گئے ہیں۔" (ص۶)

(ب) حواشی اور ان کی جدید خط میں نقول کا عالم یہ ہے کہ بعض نقلیں ایسی ہیں کہ محولہ ورق پر وہ حاشیہ عکس میں ندارد ہے۔ مثلاً ص۲۸ پر ایضاً کے اشارے کے ساتھ جدید خط میں آخری حاشیہ "مخدوم جہاں را عرضداشت کردہ شد آدم علیہ السلام ..." سے شروع ہوتا ہے، جس کے بارے میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ متن کے ورق (۴، اب) پر موجود حاشیہ کی نقل ہے۔ جبکہ ق ۴، اب پر یہ حاشیہ ندارد ہے۔ دراصل یہ حاشیہ ق ۴، اپر ہے لیکن اسے صرف کتابت کی غلطی اس لئے نہیں مانا جاسکتا ہے کہ اس سے قبل جو حاشیے جدید خط میں لکھے گئے ہیں وہ بھی "ق ۴، اب" ہی کے ہیں۔

(ج) اسی مظلوم حاشیے کا اختتام جدید خط میں یوں ہوتا ہے۔

"مخدوم نبشتہ شدہ مرا: اگر سلام آسان بدے ہر کسے چو شبلی وسلمان بدے
تا نگردی تو مسلماں از دروں (کے خواہی) شد مسلماں از بروں"

لیکن یہ عبارت اور یہ بیت مذکورہ بالا اصل حاشیے (ق ۴، ا) میں سرے سے نہیں ہے، پتہ نہیں یہ تحریف کیونکر ممکن ہوسکی۔

(د) ازیں قبیل ص۶۹۷ اور ص۶۹۸ پر جدید خط میں حواشی کی نقول کے تحت عکس متن کے ق، الف کے حوالے سے یک سطری وچہار سطری منجملہ، عدد حاشیے کی نقلیں پیش کی گئی ہیں۔ جبکہ عکس متن کا "ق، الف" نکال کر دیکھئے تو ان میں سے ایک بھی حاشیے کا وجود نہیں ہے اور اس امید پر بھی نہ رہیے کہ یہ حاشیے "ق، ب" پر مل جائیں گے۔

(ہ) ایسی مثالیں متعدد ہیں، صرف نمونے کے طور پر چند پیش کر دی گئیں۔

(و) ایسے حواشی کی تعداد بھی بہت بڑی ہے جو عکس میں موجود ہیں لیکن جدید خط میں پیش کی گئی نقل میں ان کا ذکر ندارد ہے۔

(باقی)

اخبار علمیہ

سائنس کی بعض تحقیقات، مذہب و معاشرت میں وقتاً فوقتاً اضطراب پیدا کرتی رہتی ہیں، اس سال کی جس سائنسی تحقیق نے عالم انسانیت میں شور و غلغلہ بپا کر رکھا ہے وہ عمل کلون ہے، اسکاٹ لینڈ کے ایڈن برگ میں روجن انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے ڈاکٹر ولیمس کی رہنمائی میں ایک مادہ بھیڑ کے تھن سے ایک خلیہ لیکر اس سے ایک جین (ڈی این اے) کا جوہر نکالا اور ایک دوسری بھیڑ کے رحم میں نشوونما پانے کے لیے داخل کر دیا، بچہ ہوا تو وہ اسی بھیڑ کا ہم شکل و ہم رنگ تھا، اس کامیاب تجربے کے بعد امریکہ کے ایک سائنسداں نے اسی عمل کا تجربہ بندر پر کیا اور وہ بھی کامیاب ثابت ہوا، اس نے یہ بھی کہا کہ یہ صرف ایک خلیہ تک محدود نہیں، بلکہ ایک مادہ کے متعدد خلیوں سے بیک وقت متعدد ہم شکل پیدا ہو سکتے ہیں، وہ بیک وقت آٹھ ہم شکل بندروں کی پیدائش کا منصوبہ بنا چکے ہیں، جانوروں کے بعد اب انسانوں کی باری ہے، تجربہ گاہوں میں ایک رنگ روپ بلکہ یکساں عقل و عادت کے ہم شکل انسانوں کی پیدائش کی خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں ماضی قریب میں موت کی آغوش میں پہنچنے والے ممتاز افراد کی نقل مطابق اصل کی تیاری کی تمنا بھی ہے خطرہ ہے انسانی معاشرہ میں ان بے شمار ہم شکلوں کی موجودگی سے انتشار، عدم تعارف اور بے شمار ایسے مسائل کا امکان ہے جن سے سماجی اور عائلی زندگی کا شیرازہ منتشر ہو سکتا ہے۔

اگرچہ سائنسداں اس عمل کے بعض مثبت پہلوؤں مثلاً بڑھاپا اور بعض مہلک امراض کا علاج اور بعض ادویات جدیدہ کی ترغیب دے رہے ہیں مگر اہلِ نظر کی نگاہ اس نفع قلیل کے مقابل اثم کبیر پر ہے، چنانچہ مختلف مذاہب کے افراد و ادارے اس تجربہ کے خلاف ہیں، خود یورپ کے اکثر ملکوں نے انسانی کلون کی تحقیق پر پابندی عائد کر دی ہے، بعض اسلامی ملکوں میں بھی علماء نے اس کی قباحت ظاہر کی ہے، گو وہ کلیسا کی مانند زیادہ خائف نہیں، بعض صوفیہ کے تذکروں میں عالم مثال میں ہر سو ہم شکلوں کے ظہور کی روایتیں ملتی ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انتشار پسند اور بے سمت مغربی معاشرہ بھی اس تجربہ کے خلاف ہے تاہم مغرب کے ہم جنس اس کے حق میں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ SA-MESEX کی تخلیق مکرر کی راہ میں یہ تحقیق معاون ثابت ہوگی، نیویارک کے ایک تاجر رنیڈ ولف وکرنے تو کلون رائٹس یونائیٹیڈ فرنٹ نامی ایک محاذ بھی قائم کیا ہے، انکا کہنا ہے کہ "عوام کو تخلیق مکرر (REPRODUCTION) کا حق ہے، ہم اسی حق کا دفاع کریں گے، اگر کسی شخص کو اپنے مماثل اور بعینہ اسی شکل کے انسان کی خواہش ہے تو اس کو پیدا ہونے کا حق ملنا چاہیے"۔

فلکیات میں یہ تازہ انکشاف بھی سائنسی خبروں میں نمایاں رہا جسے "آسمانی فنگر پرنٹ" کا نام دیا گیا ہے۔ عرصہ سے انسان کے ذہن میں آسمانوں سے پرے کال کوٹھریوں (بلیک ہول) کا تصور موجود ہے، اب ان کا وجود ایک حقیقت بن چکا ہے گو ان کی کنہ و حقیقت اب بھی مبہم ہے تاہم کیفیت مجہول نہیں ہے، اب ہبل کی مشہور رصدگاہ میں ایک ماہر فلکیات نے اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر بتایا کہ یہ بلیک ہول ہر بڑی کہکشاں کے مرکز میں واقع ہیں اور یہ گیس اور کوکبی مادہ فضلہ کو اپنے اندر بڑی تیزی سے جذب کر رہے ہیں۔

ہبل کی دوربین سے تین بلیک ہولوں کا مشاہدہ کیا گیا، ان میں ایک سورج سے نصف بلین گنا زیادہ وسیع و عریض ہے، پندرہ کہکشاؤں میں چودہ کال کوٹھریوں کا پتہ لگ چکا ہے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے سلسلہ کی اب تک یہ سب سے وقیع مشاہداتی تحقیق قرار دی گئی ہے۔

حیرت کدہ افلاک میں دم دار ستاروں کا ظہور، انسان کی چشم بصیرت کے لیے خاص تجسس کا باعث بنتا رہا ہے، عوام خواہ ان ستاروں سے خائف ہوں لیکن ماہرین فلکیات ان کے ظہور و دید کے مشتاق ہی رہتے ہیں، گزشتہ سال ایک روشن ترین دمدار تارہ، برف کے گولے کے مانند سورج کے مدار میں اس انداز سے طواف و رقص میں مصروف تھا کہ لگتا تھا وہ فنا فی الشمس ہو جائے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں وہ قریباً ۴۳ ملین کیلومیٹر کے فاصلہ پر رہا، البتہ اس کی تابانی سورج کی حدت سے بڑھتی رہی زمین پر اس کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا گیا، جب یہ زمین سے پندرہ ملین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ... ۳۲۰۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرا تو ریکارڈ کے مطابق یہ زمین سے قریب ترین گزرنے والا روشن ترین ستارہ قرار دیا گیا، آسمانی دھول اور برف اور خدا جانے کن عناصر کا مرکب تارہ اب اس راہ سے دس بیس ہزار سال بعد دوبارہ گزرے گا۔ عین اس کے ظہور کے وقت امریکا کے دو ماہرین فلکیات ایمن ہیل اور تھومس باپ نے کہکشاں میں ایک اور دمدار ستارہ کا مشاہدہ کیا اور حساب لگا کر بتایا کہ سال ڈیڑھ سال بعد وہ آسمان دنیا پر اس شان سے ظاہر ہوگا کہ ہر صاحب بصارت اس کا بآسانی نظارہ کر سکے گا، اس سال یہ دم دار ستارہ واقعتاً ظاہر ہوا، ہندوستان شمال مشرق کے رخ پر اس کا مشاہدہ کیا گیا، ہیل باپ کے ناموں سے موسوم یہ

دم دار تارہ اب قابل دید فلکی تماشہ دکھا رہا ہے، جیسے جیسے یہ سورج سے دور ہوتا جاتا ہے، منوں اور ٹنوں کی مقدار میں یہ نامیاتی کیمیائی فضلہ اگل رہا ہے جو سائنسدانوں کی نظر میں زندگی کے لیے بڑا کارآمد سامان ہے، یخ بستہ پانی، ہائیڈروکاربن اور دوسرے نامیاتی سالماتی مادوں کی وافر ترین مقدار ہے جو زندگی کی آفرینش کے لیے ضروری ہے۔ یہ تصور تو پہلے بھی تھا کہ ان ستاروں میں برف کو کبھی فضلہ اور کیمیائی عناصر کائنات کی بیرونی سطح پر زمہریری منطقوں میں یخ بستہ رہتے ہیں، سورج کی زد میں آنے کے بعد یہی عناصر گرمی سے پگھل پگھل کر خارج ہونے لگتے ہیں اور اسی کو ستاروں کی دم سمجھا جاتا ہے لیکن دوسرے دمدار ستاروں اور ہیل باپ میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب ہاپکن یونیورسٹی کیلی فورنیا کے ہیرالڈ ویور نے دیا کہ فرق حجم کا ہے، ہیل باپ کا حجم ۱۹ سے ۲۵ میل ڈائی میٹر کا ہے، اس سے پہلے کسی دم دار تارے کا اتنے قریب سے مشاہدہ نہیں کیا گیا جبکہ اس دمدار تارے کی سطح بھی صاف دیکھی گئی ہے، اسی لیے اس کی دریافت سب سے اہم ہے۔ ڈاکٹر ویور نے ایک سائنسی جریدہ میں یہ بھی لکھا کہ ساڑھے چار لاکھ بلین سال پہلے نظام شمسی کی تشکیل جس کو کبھی بادل کے مادہ سے ہوئی تھی اسی مادہ سے ان دمدار ستاروں کی بھی تکوین ہوئی، سورج سے دوری کی وجہ سے ان کا یہ مادہ اب تک غیر متغیر اور اصل شکل میں موجود ہے، اب اگر ان کے علم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو یہ جواب بآسانی مل جائے گا کہ اس نظام شمسی کی تشکیل میں کن عناصر کی شمولیت تھی۔

علم سمٰوات اور تخلیق انسانی کی ہوش ربا داستانوں سے الگ یہ خبر بھی عبرت انگیز ہے کہ گزشتہ دنوں ایران میں رضا شاہ پہلوی کے اس عدیم المثال خزانہ کی ایک نمائش

بینک ملی میں ہوئی جس کی بنیاد پر سابق شاہ نے ۱۹۶۷ء میں خود کو شاہ شاہاں کا لقب دیا تھا، اس نمائش میں تخت طاؤس اور تاج کیکاؤس نے ملوکیت رفتہ اور جمہوریت موجودہ کا فرق بھی اہل نظر پر واضح کر دیا، بینک ملی کی طلسماتی عمارت میں الماس، یاقوت، زمرد، نیلم، موتی اور جواہرات ہزاروں کی تعداد میں نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے، دنیا کے تمام تراشیدہ ہیروں کا قریباً یہ نصف حصہ تھا، انچ ڈیڑھ انچ سے بڑے زمرد دنیا کی کسی تاریکی کو منور کر سکتے تھے، اس میں ۵۰۰ قیراط کا دنیا کا سب سے بڑا یاقوت بھی تھا، دریائے نور نامی گلابی اور بے داغ جوہر جو ۱۷۵ سے ۱۹۵ قیراط وزنی تھا خاص طور پر مرکز نگاہ تھا اور سب سے بڑھ کر جواہرات سے مرصع تخت طاؤس تھا جو نادر شاہ کے ہاتھوں دلی سے ایران گیا تھا، اپنی تابانیوں کے پس منظر میں کتنے سیاہ بختوں کی داستان بھی سنا رہا تھا، ایک اور اہم اور قابل دید شے ایسا گلوب بھی تھا جس میں زمین کے تمام سمندروں کو زمردوں اور براعظموں کو یاقوت، نیلم جیسے ہیروں سے مرصع کر کے دکھایا گیا تھا، اس میں ۵۱ ہزار سے زیادہ جواہرات جڑے ہوئے تھے، اس الف لیلوی خزانہ کے ایک ماہر محمد علی قہرمانی قاجار نے کہا کہ شاہ کے متروکہ اس خزانے کی اصل قیمت لگانا بڑا دشوار ہے، کیونکہ اس میں ایسے جواہر ہیں جو پہلے کبھی بازار میں آئے ہی نہیں۔

متاع دنیوی خواہ کیسی ہی مزین اور خیرہ کن ہو، بہر حال پُر فریب ہے، جسے اسلام کی دولت حاصل ہے وہی حقیقتاً صاحب ثروت ہے، محمد علی کلے اور مائیک ٹائسن دنیا کے وہ نامور مکے باز ہیں جن کو اسلام کی دولت بھی حاصل ہوئی، اب ایک خبر سے معلوم ہوا کہ برطانیہ کے سابق باکسنگ چیمپین کرسس یوبینک نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام حمدان رکھا ہے، وہ دو سال سے اسلام کے مطالعہ میں مصروف تھے اور آخر کار اس کی حقانیت پر ایمان لے آئے۔

(ع۔ص)

معارف کی ڈاک

مکتوب اکولہ

مومن پورہ۔ اکولہ
۲۷/اپریل ۹۷ء

محترم جناب اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ اپریل کے شمارہ میں جناب انیس احمد چشتی کا مقالہ بعنوان "سیرت نبوی پر ایک ہندو کی مراٹھی تصنیف" کا مطالعہ بڑے شوق اور دلچسپی سے کیا۔ چشتی صاحب نے مہاراشٹر کے واحد غیر مسلم کی سیرت پر مراٹھی تصنیف کا عمدہ طریقے سے تعارف کرایا ہے، البتہ ان کا یہ بیان ناواقفیت پر مبنی ہے کہ "سیرت نبوی پر مراٹھی زبان میں صرف تین کتابیں ہیں اور ان میں سے دو غیر مسلم مصنفین کی فکر کا نتیجہ ہیں، تیسری کتاب ابو سلیم محمد عبدالحیٔ کی حیاتِ طیبہ کا ترجمہ पवित्र जीवन کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں شایع ہوا تھا۔"
(صفحہ ۲۷۲)

اس ضمن میں عرض ہے کہ مراٹھی زبان میں جناب ابو سلیم محمد عبدالحیٔ کے علاوہ سیرت نبوی پر مزید دو مسلم مصنفین کی کتب موجود ہیں۔ پہلی کتاب محمد سعید علی ٹولکر کی لکھی ہوئی ہے جس کا نام مہان پیغمبر (महान पैगंबर) ہے، یہ کتاب عطیہ پبلی کیشنز گوڑے گاؤں ضلع رائے گڑھ سے شایع ہوئی تھی۔ کتاب پر تاریخ طباعت مذکور نہیں۔ دوسری کتاب جو ابھی سال گزشتہ ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آئی ہے وہ عبدالحمید صدیقی پاکستان کی انگریزی تصنیف کا مراٹھی ترجمہ ہے جسے اسلامک مراٹھی پبلی کیشنز ٹرسٹ بمبئی نے "محمد پیغمبر یانچے پوتر جیونی" (मुहम्मद पैगम्बर यांचे पवित्र जीवन) کے نام سے شایع کیا ہے۔

فقط والسلام

عبدالرحیم

تلخیص وتبصرہ

جمہوریہ سورینام میں اسلام اور مسلمان

جنوبی امریکا کی اس ریاست کی دریافت ان اسپینی ملاحوں اور ناخداؤں نے کی جنھوں نے سورینام کے ساحلوں پر پہلی مرتبہ قدم رکھا اور پھر ایک صدی کے بعد اس کی ملکیت کے مدعی ہوگئے، لیکن بدقسمتی سے یورپ کے دو بڑے استعمار پسند ملک ہالینڈ اور برطانیہ بھی اس کے دعویدار بن بیٹھے۔ جن کے درمیان مسلسل معرکہ آرائی ہوتی رہی، بعد میں فرانس بھی ان کی جنگ میں شامل ہوگیا اور بالآخر تینوں ہی نے اس کے حصے بخرے کرکے الگ الگ حصوں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح برٹش گیانا، ڈچ گیانا اور فرانسیسی گیانا میں سورینام کا پورا خطہ تقسیم ہوگیا۔ ۱۹۷۵ء میں جب اسے داخلی خود مختاری حاصل ہوئی تو یہ ملک سورینام کے نام سے مشہور ہوا اور ہالینڈ کی نوآبادیوں کے ساتھ دولت مشترکہ کا ایک رکن بن گیا۔

حدود اربعہ اور رقبہ سورینام کے مغرب میں جمہوریہ گیانا، مشرق میں فرانسیسی گیانا، شمال میں بحر اوقیانوس اور جنوب میں برازیل کا ملک واقع ہے، اس کا کل رقبہ ۱۶۳۲۶۵ مربع کلومیٹر ہے۔ آبادی تقریباً ۳۵۲،۰۰۰ ہے۔ دارالسلطنت پارا ماریبو ہے، جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔

جغرافیائی حالت سورینام کے قدرتی اور جغرافیائی حالات قدرے مختلف ہیں۔ ساحلی علاقے نشیبی اور ہموار ہیں جن میں متعدد دریا رواں ہیں۔ ان ہی سے متصل ریتیلے ٹیلے ہیں، ان کے علاوہ سرسبز وشاداب زمینیں بھی ہیں، بلند وبالا پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے، جو

گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ایک حصہ بالائی زمینوں کا بھی ہے جن کی سطح مرتفع ایک ہزار میٹر تک بلند ہے۔

آبادی اور باشندے | سورینام کا موسم معتدل ہے، یہاں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے یہاں ریڈ انڈین آباد تھے۔ یورپین لوگوں کی آمد کا سلسلہ سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شروع ہوا اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ڈچ استعمار کے تسلط کے وقت وہاں یورپی کثرت سے آباد ہو چکے تھے۔ ڈچوں نے سورینام میں زراعت کرنے کے لیے ہزاروں افریقی غلام بلا لیے تھے۔ اس طرح افریقیوں کی ایک بڑی تعداد بھی سورینام کے جنگلوں اور جھاڑیوں میں پناہ گزیں ہوگئی تھی۔ ان افریقیوں نے ڈچوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی لیکن سنہ ۱۲۸۰ھ میں صلح ہوگئی، افریقیوں کے علاوہ چین، انڈونیشیا اور ہندوستان کے مزدوروں کو بھی ڈچوں نے کاشتکاری کے لیے لا بسایا تھا، اس طرح سورینام میں تینوں براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ کی مشترک اور مخلوط آبادی ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

افریقی ۳ء۳۱٪، ہندوستانی ۶ء۳۷٪، انڈونیشی ۲ء۱۵٪، حبشی ۴ء۹٪، یورپی ۱٪، چینی ۵ء۱٪، ریڈ انڈین ۲ء۱٪ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ مخلوط آبادی ہے۔

پیشہ | سورینام کے اصل باشندوں کا پیشہ زراعت ہے، ساحلی علاقے کے لوگ مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ تجارت بھی یہاں کے لوگوں کا ذریعہ آمدنی ہے۔

سورینام میں اسلام کیسے پہونچا | افریقیوں کی آمد کے ساتھ سورینام کے افق پر اسلام کی کرنیں بھی پڑنے لگیں۔ کیونکہ ان میں بعض مغربی افریقہ کے مسلمان بھی تھے۔ جو سترہویں صدی عیسوی میں یہاں پہونچے تھے، لیکن غلامی اور استحصال نے انھیں نہ اپنی اصلاح و تربیت

اور نہ اپنے بچوں کی بنیادی اسلامی تعلیم پر توجہ دینے کا کوئی موقع دیا، اس طرح ان کا دینی و معاشرتی نظام درہم برہم رہا، مگر مسلسل دبے اور کچلے رہنے کی وجہ سے ان میں اضطراب اور بے چینی کا پایا جانا فطری تھا جس کے نتیجہ میں ڈچوں کے خلاف بغاوت بھی رونما ہوئی۔ جس کی قیادت ایک حبشی مسلمان لنلنے کی پھر ان کے درمیان معاہدہ "یوکا" عمل میں آیا اور بالآخر ڈچ استعمار کو جھکنا اور مجبوراً مسلمانوں کے حق آزادی کو تسلیم کرنا پڑا، آج بھی یہ مسلمان "جیوکا" کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے اکثر رسم و رواج اسلامی ہیں۔

ایشیائی مسلمان سورینام میں ان مزدوروں کے ساتھ آئے جن کو ڈچ حکمراں انڈونیشیا، ہندوستان اور جنوب مشرق ایشیا سے بطور غلام لاکر ان سے کاشتکاری کراتے تھے، ان مزدوروں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہوتی تھی۔ بعد میں شام کے علاقوں کے کچھ عرب قافلے بھی آئے۔ یہ سلسلہ موجودہ صدی کے نصف اول تک برابر جاری رہا۔ بعض اسلامی ذرائع کے مطابق سورینام میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ چھ ہزار ہے اور وہ وہاں کی مجموعی آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ جن میں انڈونیشی پچھتر ہزار، ہندوستانی و پاکستانی تیس ہزار اور باقی افریقی مسلمان اور سورینام کے نومسلم ہیں۔ اس طرح جنوبی امریکا کے ملکوں میں مسلمانوں کا سب سے اچھا تناسب اسی جمہوریہ میں ہے، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ایک خاص ماحول بھی یہاں بننے لگا ہے۔

جمہوریہ سورینام میں انڈونیشیا کے مسلمان خاص طور پر زراعتی علاقوں میں بود و باش رکھتے ہیں اور چاول کی کاشت کرتے ہیں۔ ان کی زبان ملاوی ہے اور یہ اسلامی روایات کے پابند ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی سورینام کے شہروں میں ہے۔

یہ تجارت پیشہ ہیں اور ان کی زبان اردو ہے، ڈچ وہاں کی سرکاری زبان ہے لیکن ملک کے اکثر باشندوں کی بول چال کی زبان "تاکی تاکی" ہے یہ یہاں کی مقامی زبان ہے جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ چنانچہ ہالینڈی، انگریزی، اسپینی کے ساتھ ساتھ اردو اور جاوی زبانوں کے الفاظ بھی اس میں شامل ہیں۔

افریقی نژاد باشندے اکثر کانوں میں کام کرتے ہیں، ان کی زبان بھی دوسروں سے جدا ہے۔ زبانوں کی کثرت اور اختلاف بعض دشواریوں کا سبب بھی ہے۔ اگر زبان کی دشواری نہ ہوتی تو جمہوریہ سورینام کی اکثریت کا مذہب اسلام ہوتا۔ غیر افریقیوں کی ایک معتدبہ تعداد اب قبول اسلام پر آمادہ ہو رہی ہے۔ حکومت و اقتدار میں بھی وہاں کے مسلمانوں کا عمل دخل ہونے لگا ہے، چنانچہ ایک مسلم شخص وزیر ہوا ہے اور قانون ساز اسمبلی کے ممبروں میں بھی ایک چوتھائی مسلمان ہوتے ہیں۔ لیکن تناسب کے لحاظ سے انکی یہ نمائندگی بہرحال کم ہے۔

اسلامی ادارے سورینام میں برصغیر کے مسلمانوں کی ایک جماعت کی تشکیل اس وقت عمل میں آئی جب ۱۳۷۵ھ میں وہاں چند مسلمان ہندوستانی علماء پہونچے۔ اس تنظیم نے متعدد مسجدیں تعمیر کیں اور مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے کئی مدارس بھی قائم کیے، دارالسلطنت کی ایک جامع مسجد اور مختلف آبادیوں میں چھ مساجد اور ایک اسلامی مدرسہ اور ایک ہائر سکنڈری اسکول کی تعمیر اسی جماعت کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ڈچ زبان میں "اسلام" نامی ایک رسالہ بھی شایع کرتی ہے۔ اس کی ایک مجلس عاملہ بھی ہے۔ یہ جنوبی امریکا کی سب سے عمدہ اسلامی تنظیم سمجھی جاتی ہے، جس کی مختلف ذیلی کمیٹیاں ہیں۔ ایک اور قابل ذکر ادارہ "اتحاد اسلامی سورینامی" بھی ہے۔ جس کو انڈونیشی مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔ اس کی سرگرمیاں بھی برصغیر کے مسلمانوں کی جماعت کے مانند ہیں۔ اب

کوشش یہ ہو رہی ہے کہ ان اسلامی اسلامی تنظیموں کو ایک اکائی کی شکل دے کر زیادہ موثر اور فعال کر دیا جائے۔

اسلامی تعلیم مسلم اقلیت کے بچے دین کی بنیادی تعلیم مساجد کے تحت چلنے والے مکاتب میں حاصل کرتے ہیں، علاوہ ازیں ابتدائی و ثانوی مدارس میں بھی ان کے لیے دینی تعلیم کا بندوبست ہوتا ہے۔ ان تمام مدارس میں طلبہ کی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔ حال ہی میں سورینام میں ایک اسلامی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔ جس کے قیام میں سعودی حکومت کے علاوہ ہالینڈ اور خود مقامی مسلمانوں کی کوشش اور مدد بھی شامل رہی ہے۔ رابطہ عالم اسلامی نے بعض ائمہ مساجد اور مدرسین کے مشاہرے مقرر کر دیے ہیں۔ درس و تدریس کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے بعض مبعوثین بھی مامور کیے جا رہے ہیں۔ سورینام کی پچاس سے زیادہ مسجدیں ملک کے مختلف حصوں خصوصاً راجدھانی پراماریبو اور اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہیں اور اسلامی مدارس انہیں مساجد سے ملحق ہیں، جن کی بدولت مسلم معاشرہ میں اسلامی عقائد و روایات رچ بس رہے ہیں۔

سورینام کی مسلم اقلیت کو درپیش مسائل وہاں کی مسلم اقلیت کو درپیش مسائل میں سب سے اہم مسئلہ قادیانیوں کا ہے جن کی منفی سرگرمیاں ان میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اسلام کے بنیادی عقائد رسالت کو متزلزل کر رہی ہیں۔ یہودیوں کی روایتی اسلام دشمنی کا سامنا بھی انہیں کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ خود مسلمانوں ہی کے کچھ طبقے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ناآشنا اور بیگانہ ہیں۔

سورینام کے ان مسلمانوں کو اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والے مبلغین معلمین کی سخت احتیاج ہے۔

(ماخوذ التضامن الاسلامی مکہ مکرمہ) ک۔ ص۔

باب التقریظ والانتقاد

سہ ماہی فکر و نظر: شبلی نمبر

از ضیاء الدین اصلاحی

مرتبہ جناب شہریار و محمد صابر صاحبان، تقطیع کلاں، صفحات ۳۹۲، قیمت ۵۰ روپے

پتہ: ادارۂ فکر و نظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

علامہ شبلی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی، ان کے کمالات اور کارنامے گوناگوں ہیں، اردو کے کسی مصنف، ادیب اور انشا پرداز پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا علامہ شبلی پر لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ غیر مختتم ہے۔ ضخیم کتابوں اور طویل مقالات کے علاوہ اردو کے متعدد رسالوں نے ان پر خاص نمبر بھی نکالے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ اردو علی گڑھ کے رسالہ ادیب نے مولانا پر ایک ضخیم نمبر نکالا تھا جو آج تک حوالہ و استناد کا کام دے رہا ہے اور اب وہیں سے مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی رسالہ فکر و نظر کا شبلی نمبر بڑی آب و تاب سے شایع ہوا ہے۔ جس کو کنور محمد اخلاق خاں شہریار نے اپنے شریک کار محمد صابر کی مدد سے مرتب کیا ہے۔

جناب شہریار و محمد صابر کی ادارت میں فکر و نظر کے کئی خصوصی شمارے نکل چکے ہیں شبلی نمبر اسی سلسلہ کی کڑی ہے، سرورق علامہ کی شاندار تصویر سے مزین ہے مضامین کی تعداد ۲۱ ہے جو ان عنوانات کے تحت درج ہیں:

شعر و نقد شعر: ۹ مضامین۔ مشرق اور علوم مشرق کے زیر عنوان ۴ مقالے

سیرۃ النبی اور علم کلام کے تحت تین مضامین، علمی و ادبی روابط میں ۴ مقالے اور آخری عنوان جہان معنی کتابوں اور مضامین کی فہرست کے لیے مختص ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور کے مضمون سے اس خاص نمبر کا آغاز ہوا ہے، مولانا شبلی کی اردو شاعری پر ان کا تبصرہ نپا تلا اور متوازن ہے، ان کے خیال میں شبلی کی شاعری ان کی خلاقی کے بحر بیکراں کی ایک موج ہے، مگر یہ موج بھی کسی آب جو کی ہلکی سی لہر نہیں ہے بلکہ جوئے کوہستان کا سا جلال و جمال رکھتی ہے، ان کی مثنوی صبح امید میں جو مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں سرسید کے متعلق ہے کئی جگہ دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے، جس ایجاز و اختصار کی وجہ سے گلزار نسیم کی شہرت ہے، وہی ایجاز و اختصار اور بلاغت یہاں بھی جلوہ گر ہے، فرق یہ ہے کہ وہاں حسن و عشق اور جادو و طلسم کی منظر کشی ہے یہاں قوم کے امراض اور مریض غم کی چارہ گری کا بیان ہے۔ سرور صاحب نے مولانا کی اکثر نظموں پر اظہار خیال کیا ہے، عدل جہاں گیری میں نور جہاں کے بے مثال حسن کی تصویر جس طرح کھینچی گئی ہے اسے علامہ شبلی کی شاعری کے نقطۂ عروج اور بلاغت کلام کی معراج بتایا ہے اور اس شعر:

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ   جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

کے بارے میں لکھا ہے "اردو میں اس معجز بیانی کی کوئی اور مثال اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے"۔

شعر و نقد شعر ہی کے زیر عنوان اردو کے مشہور اہل قلم پروفیسر گیان چند نے علامہ شبلی کے نقد مثنوی کے وہ اصول منضبط کیے ہیں جو ان کے ذہن میں تھے، مگر گیان صاحب کے بقول وہ ان کو باضابطہ طور پر پیش نہ کر سکے بلکہ ان کو دو ٹکڑوں میں منتشر

کر دیا، جین صاحب نے اس طرح سے دس اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ پاکستان کے وزیر آغا نے مولانا شبلی کی سیاسی نظموں کی بعض خصوصیات پر اچھی بحث کی ہے۔

پروفیسر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی نے تردید موازنہ اور رد الموازنہ کا تعارف کرایا ہے، یہ دونوں کتابیں مولانا شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں لکھی گئی تھیں۔ اسی حصہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے بزرگ استاد اسلوب احمد انصاری نے بھی موازنہ کو اہم کارنامہ قرار دینے کے باوجود اسے بہت کچھ مجروح اور داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ موازنہ کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی مگر اس کی تردید میں لکھی جانے والی کتابیں اور تحریریں نسیاً منسیاً ہو چکی ہیں، مرزا خلیل احمد بیگ نے شعر العجم کے حوالہ سے مولانا کے تصور لفظ و معنی اور اسلوب کی وضاحت بہتر طور پر کی ہے، علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق استاد اخلاق احمد صاحب کے مضمون "علامہ شبلی مکتوبات کے آئینہ میں" کچھ متضاد اور خیالی باتیں بھی آگئی ہیں۔ تاہم اپنے بے تکلف برجستہ اور بے ساختہ انداز بیان کی وجہ سے یہ کیفیت و دلآویزی سے خالی نہیں ہے۔ مگر اس کو شعر اور نقد شعر کے زیر عنوان شامل کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے حصے کے چاروں مضامین خوب ہیں، اس کی ابتدا برصغیر کے نامور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مضمون "ادب اور مشرقی تاریخ کے مخزن۔ شبلی" سے ہوئی ہے، انہوں نے اپنے خوبصورت اور دلکش انداز میں ادب و تاریخ میں مولانا شبلی کی عظمت و بلند پائیگی دکھائی ہے، ان کی بعض تصانیف کو اردو لٹریچر میں سنگ میل قرار دیا ہے اور ان کی متعدد خصوصیات اور مولانا کی اولیات بتائی ہیں، علی گڑھ کے شعبہ عربی کے پروفیسر راشد ندوی نے مولانا شبلی کے سفرنامہ روم و مصر و شام سے

ان اسلامی ملکوں کے سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور تعلیمی حالات کا مرقع تیار کیا ہے، جامعہ ملیہ کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر شعیب اعظمی نے مولانا کے فارسی اشعار کی روشنی میں ان کا فنی و ادبی جوہر دکھایا ہے، جناب رئیس نعمانی کے سیر حاصل مضمون میں مولانا شبلی کے فارسی کلیات میں شامل مختلف اصناف کی ہر ہر نظم کے بارے میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ وہ کب اور کس موقع پر کہی گئی ہے، نعمانی صاحب کو فارسی زبان و ادب پر عبور ہے، اس کا اندازہ اس زبان میں ان کے مضامین نظم و نثر سے ہوتا ہے، اس بنا پر ان کے یہ اعترافات باوزن سمجھے جائیں گے کہ مولانا شبلی چودھویں صدی کے چار بڑے فارسی کے شعراء میں تھے، ان کا کلام شعرائے اہل زبان کے کلام سے لگا کھاتا ہے، ان کا فارسی ادب و شاعری کا مطالعہ اپنے معاصرین میں غالباً سب سے وسیع اور ان کا ذوق سخن بہت معیاری تھا، گزشتہ سو سال کے اندر ہندوستان میں کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گزرا جس کے کلام میں شبلی کے معیار کا برجستہ، شگفتہ اور رچا ہوا تغزل پایا جاتا ہو۔

تیسرے حصہ کا پہلا مضمون اس ناچیز کا ہے جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا ہے اور مولانا کی سیرۃ النبی میں ادبی رعنائی و گل کاری دکھانے کی کوشش کی ہے، دوسرا مضمون علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کا بہت مفصل اور معلومات افزا ہے، اس میں سیرۃ النبی کی تالیف و اشاعت میں مصنف کو جو ہفت خواں طے کرنا اور خیال و عمل کے جن مراحل سے گزرنا پڑا ان سب کا استقصا کیا گیا ہے۔ بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا شبلی کی اصل جولان گاہ تاریخ نہیں علم کلام ہے، اس کی ترتیب و تدوین نیز علم کلام کی اصلاح و تجدید میں اولیت و انفرادیت کا شرف انہی کو حاصل ہے۔

چوتھے حصہ میں علی گڑھ کے استاذوں ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی اور ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی کے مضامین بڑے سیر حاصل اور معلومات سے پُر ہیں، اول الذکر نے علی گڑھ کے تعلق سے مولانا کے تمام واقعات و جزئیات قلم بند کرکے دکھایا ہے کہ مولانا نے علی گڑھ کو کیا دیا اور اس سے کیا لیا، ابو سفیان اصلاحی نے عربی زبان کے سلسلے کی مولانا کی ایک ایک خدمت کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

اس نمبر کا سب سے آخری مگر بہت کارآمد مضمون وہ ببلوگرافی ہے جس کو ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ڈپٹی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ یونیورسٹی نے بڑی محنت و کاوش سے مرتب کرکے علامہ شبلی پر علمی و تحقیقی کام کرنے والوں اور ان کے قدر دانوں کو زیر بار احسان کیا ہے۔ اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مولانا شبلی کی تصانیف اور مقالات کب اور کہاں سے شایع ہوئے۔ انکے کتنے ایڈیشن کس کس سال نکلے ہیں، کن زبانوں میں مولانا کی کس تصنیف کے ترجمے اور تلخیص ہوئی اور وہ کہاں سے اور کب شایع ہوئی۔ ان پر کون سی کتابیں اور مضامین دوسروں نے لکھے اور وہ کب اور کہاں سے شایع ہوئے۔ پی۔ ایچ ڈی کے مقالوں اور خاص نمبروں کا علحدہ ذکر ہے۔ گو یہ فہرست بالکل مکمل نہیں تاہم بڑی حد تک جامع ہے اور اسے دیکھ کر جہان شبلی کی نیرنگیوں کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے کہ

جمع در پیکر شبلی جہانے بودہ است یوسف گم گشتۂ ما کاروانے بودہ است

غرض پورا نمبر رنگارنگ و متنوع مضامین کا ایک حسین گلدستہ ہے، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب ہے مگر علامہ شبلی نے علم و ہنر کا جو تازہ جہاں آباد کیا تھا وہ اتنا کثیر الجہات اور وسیع الاطراف ہے کہ اسکی پیمائش اور احاطہ مشکل ہے اس لیے اس میں مولانا کی شخصیت کے بعض گوشوں اور کچھ علمی، تعلیمی اور قومی خدمات کا نظر انداز ہوجانا تعجب خیز نہیں اور نہ اس کمی سے اس مفید نمبر کی قدر و قیمت میں فرق آتا ہے، علامہ شبلی پر تحقیق و مطالعہ کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مطبوعات جدیدہ

اطہر ہاپوڑی حیات و فن شاعری از شاہدہ افضال مرحومہ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۴۰، قیمت ستر روپے، پتہ: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، یوپی۔

مولانا اطہر ہاپوڑی اس صدی کے نصف اول میں اس بزم دوشیں کے آخری رکن رکین تھے جسے امیر و داغ اور جلال و تسلیم جیسے باکمال اصحاب شعر و سخن سے اصلاح و تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ ان کی قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ صرف فارسی میں انہوں نے ہزاروں غزلیں کہیں، اردو میں غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی اور قطعات تاریخ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، ان کے نعتیہ قصائد اور ایک نعتیہ مثنوی "لیلۃ الاسراء" ان کے کمال فن کا آئینہ ہیں، مثنوی کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ "اردو میں اس نوعیت کی مثنوی نہیں دیکھی گئی" جس میں حضرت اطہر کی شگفتہ بیانی اور نازک خیالی نے اور بھی تاثیر پیدا کردی ہے، وہ اردو زبان کے نباض تھے، فن عروض میں تو گویا درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، ۱۹۲۵ء کے معارف کے ایک شمارہ میں فن عروض سے متعلق ان کا عالمانہ مضمون شایع ہوا تھا، حیرت اور افسوس بھی ہے کہ ابھی تک نہ ان کی کوئی تصنیف شایع ہوئی اور نہ ان کے حالات ہی قلم بند کیے گئے، زیر نظر کتاب نے جو دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے یک گونہ اس کی تلافی کی ہے، اس میں ان کے سوانح، مضامین، مکتوبات اور

تصنیفات کا جائزہ سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے، بعض نامور شعرا اور معاصروں پر انکی تنقیدیں باوزن ہیں، ماہر، میکش، جوش، سیماب، ریاض، فانی حتی کہ غالب کے بعض عروضی اسقام کی نشاندہی زبان و بیان پر ان کے عبور کا ثبوت ہے، غالب کو انھوں نے عروض سے قطعاً ناواقف بتایا ہے، ان کے ادبی خیالات کا بہترین مظہر ان کے مکتوبات ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "انبیائے اولوالعزم کے ساتھ جو برتاؤ عالم شعر میں کیا جاتا ہے، نعوذ باللہ منہا، شعر کے حدود جدا ہیں، شریعت کے جدا... ہمیشہ وہی شعر اچھا ہوتا ہے جس میں سلاست بیان زیادہ ہو جس شعر کے معنی یعنی کر کے سمجھائے جائیں وہ شعر لایعنی ہے۔" ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اہل زبان کی سند کے بغیر ہندی لغت نویسوں کے قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس ہے کہ ہونہار مصنفہ عین کم سنی میں کینسر کے موذی مرض کا شکار ہوئیں، ان کے حالات ان کے بزرگ جناب نفیس سندیلوی کے پُر درد قلم سے ہیں جن کو پڑھ کر مغفرت اور صبر کے کلمات بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔

شرف محنت و کفالت

از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۶۴، قیمت درج نہیں، پتہ: ثنا پبلی کیشنز ۱۵۹، ۱۶/۳، لہری بلڈنگ، مولانا آزاد روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸۔

اسلام دین کامل ہے، عقائد و عبادات کی طرح اس نے وسائل رزق کی فراہمی، اکل حلال، محنت، مزدوری اور مال و دولت کے حصول کی ترغیب دی ہے، اور انفاق و صدقات و زکوٰۃ کا مکمل حکیمانہ مالی نظام پیش کیا ہے لیکن دوسرے عبادات کے برعکس اس پہلو سے کما حقہ اعتنا نہیں کیا گیا اور دولت و ثروت سے

استغنا کا رجحان بعض عوامل کی وجہ سے اس قدر غالب ہوتا گیا کہ اسے دینداری و تقویٰ کے منافی باور کر لیا گیا، لائق مولف کی نظر میں اس وقت صنعت و حرفت، زراعت و تجارت میں اجیر و متاجر، کاشتکار و دستکار اور گھریلو خدمتگار جن مشکلات سے دوچار ہیں اس کی اصل وجہ اصول اسلام سے عدم واقفیت اور دین کو محض رسموں اور تبرک کی چیز سمجھ لینا ہے۔ لائق مولف نے محنت و اجرت اور انفرادی معاشی حقوق پر تفصیل سے بحث کر کے محنت اور پیشوں کے حقیر و مذموم ہونے کے جاہلی تصور کو غلط قرار دیا ہے، اس ضمن میں بتایا ہے کہ یہودی ساہوکاروں کے استحصالی کاروبار کا خاتمہ حضرات صحابہؓ کی محنت و صلاحیت نے کیا، انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ موجودہ دور کے اختصاص اور اسپیشلائزیشن کا اولین عملی نمونہ اسلام ہی نے پیش کیا۔ پہلے یہ مفید تحریریں ممبئی کے رسالہ البلاغ میں شایع ہوئی تھیں، اب کتابی شکل میں ان کی اشاعت افادیت میں اضافہ کا باعث ہوگی۔ کتاب کا مقدمہ مولانا سید محمد رابع ندوی اور پیش لفظ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔

تعلیم ایک تحریک

از جناب محمد اسحق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۱۲، قیمت ۵ روپے، پتہ: ۱۱-۴-۱۴۳/۶، بازار گارڈ BAZAR GARD، حیدرآباد، اے پی۔ ۵۰۰۰۴۰۔

اس کتاب کے لائق مصنف عملاً تعلیم کے فروغ کے لیے وقف ہیں، اس سے پہلے ان کی ایک کتاب "تعلیمی مسائل" پر ان صفحات میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے، زیر نظر کتاب بھی انکے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں تلقین و ترغیب و تحریک کے جذبہ کے زیر اثر اسرائیل کی ترقی کا راز، تعلیم الامین تحریک کے بانی، ابراہم لنکن کا خط، انگریزی زبان کی اہمیت کے

علاوہ بچہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے، تعلیم میں مسابقت کا جذبہ، تعلیم ایک تحریک، اچھے اساتذہ کی تلاش اور دینی درسگاہوں میں عصری تعلیم کا امتزاج جیسے مفید اور اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی پسماندگی اور خستہ حالی کے ازالے کے لیے تعلیمی تحریک کو گوشے گوشے تک پہنچانا چاہتے ہیں، ایک مضمون میں محترمہ عائشہ بیگم کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا اور اب وہ دوسرے بچوں کے لیے سرگرم عمل ہیں، یہ کتاب خاص طور پر تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کے مطالعہ میں آنے کی چیز ہے، مگر کمپیوٹر کے اغلاط خاصے ہیں۔

دھوپ دریا

از جناب شکیل اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۳۶، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

یہ مجموعہ غم امروز و فردا، عصری کرب و اضطراب اور لہجہ و آہنگ کی جدت و تازگی کے باعث عام شعری مجموعوں سے منفرد اور جدا ہے، جواں سال ہونے کے باوجود کلام میں پختگی ہے، پہلے ہی شعر میں۔ دعا کی گئی کہ ع مری غزل کو نیا پن بھی دے رچاؤ بھی دے، یہ مجموعہ اس کی قبولیت کا ثبوت ہے۔ ندی، جھیل، پانی، ناؤ، رات، جگنو، خانہ بدوشی اس مجموعہ کی محض چند علامات ہی نہیں، اعظم گڑھ سے سورت تک شاعر کی زندگی کی حقیقتیں ان میں پنہاں ہیں، خلیل الرحمن اعظمی اور جاں نثار اختر کے اثرات کے باوجود نوجوان شاعر کا اپنا منفرد انداز ہے، ماں کے نام کتاب کا انتساب میں یہ شعر ہے:

کبھی سوتے میں ایسا لگتا ہے
سر کے نیچے تری ہتھیلی ہے

انتساب کی یہ پاکیزگی اور کرب روحانی، شاعر کے احساسات کو خود ہی متعین کر دیتے ہیں، دیوان چھپانے کی ضرورت یہ بیان کی گئی ہے کہ ع جی میں آیا ہے کہ جذبات کا سودا کر لوں یقیناً اس سودے میں اردو شاعری کو نفع ہوا ہے۔